قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط وکتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳۔ہسپتال روڈ۔لاہور

فن۔ ۷۲۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ —— نومبر ۱۹۹۲ء —— شمارہ ۱۱

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک —— ۱۸/ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۲
اخلاقی بے راہ روی	علامہ غلام احمد پرویز	۵
رابطۂ باہمی	ناظم ادارہ	۲۱
نفسِ واحدہ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۲۴
نامے جو میرے نام	ادارہ	۳۸
ملاوٹ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۴۰
اوسلو نامہ	عبداللہ ثانی	۵۳
سیلاب کی تباہ کاریاں	محمد عمر دراز	۵۸
اقبال کا پیغام	ثمینہ ظہور	۶۳
حقائق و عبر	ادارہ	۶۸
خرچ (بچوں کے لئے)	علامہ غلام احمد پرویز	۷۴
انگریزی مضمون (بچوں کے لئے)		۷۶
درسِ قرآن		۷۸

لمعات

"وارننگ"

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

"قرآنِ کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے، اتنی اہمیت کہ اس نے کہا کہ

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ .... (۲۴/۳۴)

ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں بھی۔

اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں بیان کرنے کا مقصد کیا تھا یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔

قرآنِ پاک نے وہ قوانین جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔

وہ اپنے اولین مخاطبین کو یاد دلاتا ہے کہ "تم ان کی تباہ شدہ اُجڑی ہوئی بستیوں سے گزرتے ہو، دیکھتے نہیں ہو کہ وہ کیسے تباہ ہوئیں حالانکہ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں اور قوت و حشمت میں بھی ان سے بڑھ کر، ان کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑھے ہوئے تھے ــــ مگر جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی نہ ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔" (پرویزؒ صاحب کے ایک خطاب سے اقتباس)

قرآنِ پاک میں متعدد اقوام کا ذکر ہے، وہ ان کے غلط نظامِ زندگی کے نمایاں ترین گوشے کو اجاگر کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ وہ قوم اس لئے تباہ ہوئی کہ وہ فلاں معاشی یا معاشرتی یا اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھی اور اپنی روش کو چھوڑنے پر تیار نہ تھی، ان کے پاس جو انبیاء کرامؑ آئے انہوں نے ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا

مگر انہوں نے انبیاءؑ کی بات نہ مانی، ان کی مخالفت کی اور تباہی کی طرف بڑھتی گئیں۔

قومِ نوحؑ کا ذکر آتا ہے تو وہ اُن معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں عزت کا معیار دولت ہے، جہاں محنت کشوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جہاں کے سردار ان قوم محض اس وجہ سے خدا کے فرستادہ کی بات سننے کو تیار نہیں کہ اس کی محفل میں وہ محنت کش جمع ہوتے ہیں وہ جن کے برابر بیٹھنے کو تیار نہیں۔

قومِ عادؑ کا ذکر ہے جو اپنی تہذیب و تمدن کی بلندیوں میں نازاں ہے مگر اُن کی یہ بلندیاں ایک ایسے نظام کی پیداوار ہیں جو سلب و نہب (EXPLOITATION) پر استوار ہے، جبر پر استوار ہے۔

قومِ ثمودؑ کا ذکر ہے جہاں کمزوروں، زیردستوں پہ عرصۂ حیات تنگ ہے، معاشی نظام میں ذرائع پیداوار اوپر کے طبقوں کی میراث ہیں، اللہ کی زمین اور اس کے وسائل، اللہ کے بندوں کے مفاد کے یکساں وا نہیں ــــ ارض اللہ اور ناقۃ اللہ کی مثال یہی واضح کرنے کے لئے دی گئی۔

قومِ شعیبؑ کو ان کی معاشی بداعمالیوں کی طرف توجہ دلائی گئی، جو ناپ تول میں کمی کرتی تھی، انسانوں کو، ان کی POTENTIALITIES کو ناپتے وقت بھی اپنا مفاد مدنظر رکھتی تھی اور انہیں وہ کچھ دینے کو تیار نہ تھی جس کے وہ حقدار تھے۔ ــــ اور پھر یہ قوم مذہب کو ظواہر کی پابندی تک محدود کر کے معیشت پر اس کی طرف سے عائد پابندیوں کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

قومِ لوطؑ ہے جو اپنی جنسی بدنہادی کی وجہ سے تباہی سے ہمکنار ہوئی اور پھر فرعون اور قومِ فرعون اور بنی اسرائیل کا ذکر ہے جہاں انسانیت تہری غلامی میں جکڑی ہوئی ہے، مستبد حاکم ہے جس کی سرکشی، حدود فراموش ہو چکی تھی اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۷۹) اور اس کے ساتھی ہیں جو تکبر و نخوت کے پیکر ہیں۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ (۲۳/۴۶) اور ان کے علاوہ مذہبی پیشوائیت کی گرفت ہے ــــ فرعون اور اس کے ساتھی قارون سرمایہ داری کا نمائندہ، ہامان اور اس کے جنود ــــ

اور پھر حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہے ــــ جہاں حاکم تو رومی شہنشاہیت ہے مگر وہ صرف اپنا دائرہ کار سیاسی امور سے رکھتی ہے اور مذہبی امور پیشوائیت اور اس کے چیلے چانٹوں کے رحم و کرم پہ ہوتے ہیں۔

وہ مسیح کے لئے کفر و الحاد کا فتویٰ مرتب کرتے ہیں، سزائے موت تجویز کرتے ہیں تو قتل کے محضر نامے پہ دستخط رومیوں کے گورنر سے کروانے پہ مکلف ہیں ــــ

ان سب اقوام کے ذکر کے بعد قرآنِ پاک نے مخاطب قوم کو یاد دلایا کہ

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳/۶۲)

خدا کی وہ روش جو اقوامِ سابقہ کے سلسلے میں کارفرما تھی تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔"

اور یہ یاددہانی صرف اس قوم کے لئے نہیں تھی جو اس وقت موجود تھی، یہ ہمیشہ کے لئے، ہر قوم کے لئے یاددہانی ہے کہ خدا کی روش تبدیل نہیں ہوتی، خدا کا قانونِ مکافات ہمیشہ کارفرما رہتا ہے اور جو بھی قوم وہ روش اپنائے گی جو ان اقوامِ سابقہ نے اپنائی ان کا وہی حشر ہوگا جو اُن کا ہوا۔

اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم صدقِ دل سے جائزہ لیں کہ ہماری روش کیسی ہے، کیا ہم میں وہ تمام برائیاں نہیں جن میں سے کوئی ایک گنوا کر اللہ تعالیٰ نے انہیں بھیانک انجام کا سزاوار ٹھہرایا، آج ہمارے ہاں کونسی وہ برائی ہے جو انتہا کو نہیں چھو رہی، رشوت، سفارش، زور آوروں کی طرف سے دھونس، دھاندلی، نہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ عزت، ناپ تول کے ہر میدان میں ہم ڈنڈی مار رہے ہیں، حقدار محروم ہیں اور جن کا کوئی حق نہیں سرفراز ہیں ــــ

ان حالات میں مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے کوئی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں اور اس کا حل نہ عسکری قوت کو زیادہ بڑھانے میں ہے، نہ تجارت کی ترقی میں، نہ کارخانوں کی بہتات میں، نہ پرائیوٹائزیشن میں نہ نیشنلائزیشن میں، جب تک ہم اللہ کے دئے ہوئے پیمانوں کے مطابق معاشرے میں تبدیلی نہ لائیں گے، وحی کے دئے ہوئے پیمانوں کے مطابق اسے نہ ڈھالیں گے ہم تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے جو ہر پیغمبر نے مخاطب امت سے کہا، یعنی اعبدوا اللہ یعنی زندگی کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت ــــ روس کی عسکری قوت اور سائنسی ترقی اُسے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہ بچا سکی، روس کی پسماندہ ریاستیں تک ایٹمی توانائی کی حامل ہیں مگر یہ ان کے کسی کام نہ آئی۔ سائنسی ترقی بجا مگر ان ایجادات کو بھی وحی کی مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہوگا، اگر ایسا نہ کیا جائے تو وقت کا پہیہ قانونِ مکافاتِ عمل،

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اخلاقی بے راہ روی

تمدنی زندگی کی تباہی و بربادی

نوائے وقت رپورٹ

حال ہی میں امریکی ہفت روزہ نیوز ویک نے یورپ میں اخلاقی اقدار کی ناقدری اور شادی کے بارے میں آزاد خیالی کی روش کے باعث بچوں کی ناجائز پیدائش پر ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے ایسی پیدائش میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے جبکہ ڈنمارک میں یہ شرح سب سے زیادہ ہے یعنی پچاس فیصد ہے۔ دوسرے نمبر پر فرانس اور برطانیہ میں جہاں ناجائز بچوں کی پیدائش کی شرح ۳۰ فیصد ہے۔ آئرلینڈ میں ۱۷ فیصد، جرمنی میں ۱۶ فیصد، ہالینڈ میں ۱۲ فیصد اور اٹلی میں ۷ فیصد ہے۔ نیوز ویک نے ماضی کے حوالے سے اس رپورٹ میں بتایا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں یہ شرح برائے نام یعنی ۱۲ فیصد تھی مگر اب یہ شرح ہوشربا ہو چکی ہے۔ اگرچہ نیوز ویک نے اس پر براہِ راست اخلاقی اقدار کی ناقدری کے حوالے سے کوئی زیادہ تبصرہ نہیں کیا مگر اس مسئلے کے معاشرتی اور معاشی پہلوؤں پر ایک بسیط محاکمہ پیش کیا ہے کہ ایسی ماؤں اور بچوں کا مستقبل کیا ہوگا اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کس کا ذمہ ہوگی۔

درج ذیل مضمون جسے مرحوم غلام احمد پرویز نے رقم کیا تھا اس میں ایسے نکات و امور کی گرہ کشائی کی گئی ہے جو قوموں کی تمدنی زندگی کو گھن کی طرح چٹ کر جاتے ہیں۔ اس کی اشاعت کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ امید ہے قارئین اسے ان ہی سطور کی روشنی میں پڑھیں گے کیونکہ کسی بھی قوم کی تمدنی زندگی میں اخلاق کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور رہا ہے، جبکہ موجودہ خوشحال ممالک میں اس قسم کی "بے راہ روی" کو فرد یا فریقین کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔

ادارہ

(بحوالہ نوائے وقت، جمعہ میگزین ۲/۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص و لزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا پینا سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے از خود عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے گوشت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف کھینچ کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں از خود عائد ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس انسانی بچے کو دیکھئے وہ سنکیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے مُنہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح مصری کی ڈلی کو۔ وہ کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے از خود ایسی پابندیاں نہیں عائد ہوتیں جیسی حیوانات پر عائد ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ نہ ہوں بلکہ معاشرتی پابندیاں خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوں۔ معاشرے کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بنا پر بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رو سے عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے۔ اس فیصلہ کی رُو سے بائیں چلو سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر "دائیں طرف چلو" کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحیٔ خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحم خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحیٔ خداوندی کے ماننے والوں کو لحم خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

حیوانات پر طبعی کنٹرول کے علاوہ کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عائد کی جاتی ہیں اور وحی کی رُو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام و ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں۔ نیز کسی ایک ہی قوم میں مختلف زمانوں میں ان پابندیوں میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط پیدا کر لیں تو معاشرہ کی

نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں، نہ ہی ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کرلے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردّوبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس

نکاح اور قانونی ایجاب و قبول شرفِ انسانی کے اعلیٰ اوصاف ہیں جس پر ایک شریف معاشرہ تشکیل پاتا ہے

وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے۔ ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرے کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ وقس

مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کرسکتا ہے۔

وحی کی پابندیاں اس کے برعکس۔ اس باب میں وحی (یعنی قرآن کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو باہمی تعلقات کی قطعاً اجازت نہیں۔ اور شادی کے بعد نہ بیوی کسی غیر مرد سے تعلق پیدا کرسکتی ہے نہ میاں کسی اور عورت سے۔ بلکہ معاشرہ کا جرم ہے اور اس (جرم زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردّوبدل نہیں کیا جاسکتا۔

مغرب کی اخلاقی بے باکیوں سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائشِ نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل ہے اور بس اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہیئے اور نکاح وغیرہ کی پابندی محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہیئے نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) ایسی فضا عام ہوتی جا رہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں (یعنی عفت و عصمت) کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں یا ان کا تعلق عالم انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا

جس قوم کے مرد اور عورت باعصمت ہوں وہی نجات پانے والی قوم ہوتی ہے

علیٰ ہذا۔ (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔

مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ہے تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ (اپنے مصالح کے پیش نظر) ان میں ردّو بدل کرلے لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ عفت وعصمت کا قوموں کی فلاح وبہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں دائر المرام نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں، سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔ ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھالیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم وبصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل وبرہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائیگی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے (ترجمہ) تاآنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابت ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہوچکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور وخوض کیا جائے۔

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہوچکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محور وروش قرار پاچکی ہو ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔

علمائے مغرب کی تحقیقات، علمائے عمرانیات، تہذیب کے مؤرخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیہ نفس وغیرہ ہم نے

مغرب کے بعض ممالک اخلاقی بے راہ روی کے سبب زندگی کے ایک عذاب میں مبتلا ہو چکے ہیں

اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ سے نتائج مستنبط کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انھیں جن صبر آزما اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے، وہی کچھ پہنا جو کچھ وہ پہنتے تھے، انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہِ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔

انہی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے ڈی انون کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائجِ تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب "سیکس اور کلچر" میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

"دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ ماحصل تحقیق اور اس کا سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔ اصل کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں"۔

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو اس

کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔"

آپ نے غور کیا کہ یہ محض اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔

جنسی بے راہ روی بے شمار اعصابی بیماریوں کو جنم دیتی ہے

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں جیسی وہ تبدیلیاں کرے گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے سب سے پہلے تجرد کی زندگی کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلک خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ جبری تجرد کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ عیسائیت یا مسلک خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرف انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ جس گروہ نے کنوارپن کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی سے کبھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

۲۔ جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔

۳۔ تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت سخت دیکھ بھال کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق و معاشرتی جرم قرار دیتے تھے

نکاح کا معاہدہ عمر بھر کی رفاقت کا عہد نامہ ہوتا ہے

اس کے بعد ڈاکٹر انون شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے زندگی کی عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے یعنی (۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتہ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج ہے۔ (۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعددِ ازواج ہے اور (۴) اگر مرد دوسری عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعددِ ازواج کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ آج تک کوئی قوم شق نمبر ۱ کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرماں بردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرے میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق نمبر ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ فسخ نہ ہو بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہو سکتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے مختلف ماہرین علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توا'

میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی۔

عیسائیت تجرد کی زندگی کو روحانی ارتقا کے لئے شرطِ اولین قرار دیتی ہے

فرائڈ کی تحقیق:۔ بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ (جب ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں۔

فرائڈ نے اس طریقِ عمل کا نام سبلیمیشن رکھا ہے۔ یہ علم تجزیہ نفس کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں (جسے عام طور پر ازمنہ مظلمہ کہا جاتا ہے)۔

قرآن نے کظامت کا کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب

سورہ آلِ عمران میں مومن کی ایک صفت کاظم غیظ بتائی گئی ہے

ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا، کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریقِ عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا۔

کہا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے، وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کے ماہرینِ تجزیہ نفس نے سبلیمیشن سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبہ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔

قرآنِ کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اثم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں الاثمۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے۔ وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں، وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو قطعاً داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرمِ زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضیٔ مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ "ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) از حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن۔ مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے

عورت اور مرد کے تعلقات میں مذہبی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی سے ہی ایک اعلیٰ معاشرہ وجود پاتا ہے

بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہیئے تھا)۔ اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے نکاح کا معاہدہ اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔

علاوہ بریں اس نے وحدتِ زوج کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعددِ ازواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے حکم نہیں) آپ دیکھیں گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدتِ ازواج کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک "مطلق وحدتِ زوج" میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے لیکن قرآن نے بناہ نہ ہو سکنے کو فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور نکاح کے بعد ازدواجی حالت میں صرف ایک جوڑے کو باہمد گر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوع کی خاطر تنوع کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کے ساتھ غیر مسافحین (۴/۲۴) کا اضافہ کیا ہے۔ حصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصور ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جائے اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف طریق سے مہیا کئے جائیں اور ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے

علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہوا اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا، تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے!

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر انون نے اپنی تاریخ کے دوران میں ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رُک گئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہلِ کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ سپین میں۔ کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازع رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت نکاح میں وحدت زوج بطور اساسی اصول۔ اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علی حالہٖ قائم رکھنے کی صلاحیتیں۔

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی' وہ واقعات کے اسباب و علل کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی' جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معلومات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے۔ (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)..... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں..... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو' کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے' جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر و نیاز' گنڈا تعویذ' اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسل متواتر چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی خواہشات پوری کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔

ہمارا نوجوان طبقہ

یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنھوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے ازمنۂ مظلمہ کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے ملے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر..... بچپن ہی سے وہ ہر ایسا کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو..... مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش ہوئی اسے اسی وقت کسی نہ کسی

طرح پورا کرلیا۔

اس کا نتیجہ

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جارہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اسے خود ڈاکٹر الفون کی زبان سے سُن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ "لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹایا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمر ہوتی ہیں لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاہمت کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو بھی کھالے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی

تطہیر قلب و نگاہ

بے راہ روی سے بچنے

کی ضامن ہے

معاشرہ ہو اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہے اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جاسکتی۔ کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی تعلقات کے مواقع کو کم از کم حدود تک محدود کردیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کردیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر الفون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ

"تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہوگئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت تک کم از کم حد تک محدود رکھ سکتی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔"

آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو! آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں یہ کہنا کہ اسلام نے مرد و عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا شاید اپنی ہنسی اڑانے

کے مترادف ہوگا لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ قاعدے اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ لہٰذا قانون کی نگاہ میں مرد و عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کر لیں۔ آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق تو کرے یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی وہ تمدن اور تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق اصولی قوانین دیتا ہے

قرآن ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جا سکتا

وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں مسلسل خطبات کے ذریعے ان تمام احکام کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاتا جس سے آپ کو اندازہ ہوتا کہ قرآن کس قسم کے معاشرہ کا نقشہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک جنسی تعلقات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ (اس کے متعلق اگر آپ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب 'طاہرہ کے نام خطوط' کا مجموعہ دیکھئے جس میں ان تمام امور کو یکجا کر دیا گیا ہے)۔ اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح بھوک، پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں قوانین کو ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اسی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ ہے۔ لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے۔ شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کو اس کا

احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو فبہا، ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی

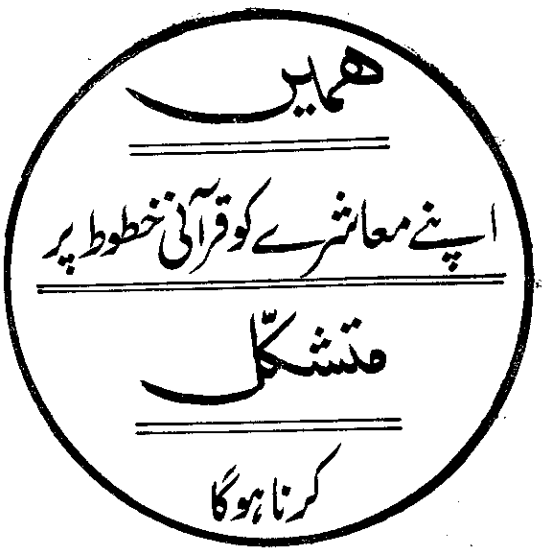

ہے کہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ بھوک پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں آپ کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالت میں حرام ہیں۔ لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ آپ اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر آپ کے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر آپ کا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا بلکہ یہ کہا ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ نہ خیالات کو طیورِ آوارہ بنایئے کہ توجہ اس طرف جائے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکاب جرم کے بعد مجرم نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آجاتے ہیں اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یعنی دل میں گزرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیرِ قلب و نگاہ کہتے ہیں۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا

ہے (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ اس کے لئے بھی وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی محرکات کبھی بے باک نہیں ہوتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

محمد لطیف چوہدری

رابطۂ باہمی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے تیرے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

بزموں کی طرف سے اپنے اپنے ہاں اجتماعات منعقد کرنے کی تجویز بزم چنیوٹ نے پیش کی لیکن پہل چک نمبر ۲۱۵ نے کی جن کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ انھیں وفورِ شوق میں مرکز سے مشورہ کرنے کا رسمی تکلف بھی گوارا نہ ہوا۔ اطلاع بذریعہ مجلہ طلوعِ اسلام دی گئی تھی۔ اجتماع کے جملہ انتظامات کے لئے چوہدری عبدالحمید صاحب کی وسیع و عریض حویلی مختص تھی جسے خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جمعرات ۱۵ اکتوبر کی صبح مہمانوں کی آمد شروع ہوئی جو بعد دوپہر تک جاری رہی۔ پہلا تعارفی اجلاس جس میں میزبانِ بزم کے علاوہ بزم بورے والا، چنیوٹ، پنج کسی اور کمیر کے ۶۰ سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی، دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہوا اور شام کے دھندلکے تک جاری رہا۔ ضلع وہاڑی کے اس دُور افتادہ گاؤں میں فدایانِ قرآنی کا اتنا بڑا اجتماع جس میں خواتین کی تعداد لاہور میں ہونے والے اجتماعات سے کم نہ تھی، پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

گذر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں مے خانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

رات کا اجلاس ۸ بجے شروع ہوا۔ جن حضرات نے فکرِ قرآنی کو آگے بڑھانے کے لئے تجاویز پیش کیں، ان میں بزم چنیوٹ کے جناب آفتاب عروج صاحب، پنج کسی کے جناب محمد حسین آزاد، بزم کمیر کے جناب گلزار احمد، بزم بورے والا کے جناب اسلم صاحب، میزبانِ بزم سے جناب محمد افضل واہلہ، لاہور سے جناب قاسم نوری اور ناظم ادارہ محمد لطیف چوہدری شامل تھے۔ مقررین نے جن باتوں پر خاص طور پر زور دیا۔ ان میں وابستگانِ فکرِ قرآنی کے ذاتی کردار کی اعلیٰ پیمانے پر نشوونما اور قرآنی تعلیمات دوسروں تک پہنچانے کے لئے دلکش اندازِ بیان سرفہرست رہا۔ میزبانِ بزم کے نمائندہ جناب عبدالحمید صاحب نے مقررین سے اتفاق کرتے ہوئے مندوبین پر زور دیا کہ وہ فروعی معاملات پر مباحث میں اُلجھنے سے پرہیز کریں اور بات کرتے وقت اپنے مخاطب کی ذہنی سطح اور جذباتی کیفیت کو پیشِ نظر رکھیں تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے

پائے۔ بزموں سے منتخب افراد کی تعلیم و تربیت کے لئے مرکز میں مختصر دورانیے کے تربیتی کورسز کی اہمیت بھی زیرِ بحث آئی اور پمفلٹوں کی مسلسل اشاعت پر بھی زور دیا گیا۔ بزموں کے مابین باہمی روابط استوار کرنے اور وابستگانِ فکرِ قرآنی میں اعلیٰ اقدار، پاکیزہ جذبات، شاندار روایات اور برتر مقاصد کو پروان چڑھانے کے لئے مختلف مقامات پر سب کنونشن/سیمینار منعقد کرانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ ناظم ادارہ نے پرچے کی اشاعت بڑھانے اور پرچہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی افادیت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک پرچہ کم و بیش پانچ پمفلٹوں کے برابر ہوتا ہے اور اس میں مختلف نوع کے ایسے متعدد مضامین شامل کئے جاتے ہیں جو مقامی ضروریات اور وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔ اس لئے جب تک پمفلٹ سکیم روبہ عمل نہیں ہوتی پرچہ پمفلٹ کا بہترین نعم البدل ہے، اسے دُور دُور تک پہنچانے کے لئے وابستگانِ فکرِ قرآنی سے درخواست کی گئی کہ وہ ادارہ کے دست و بازو بنیں۔ مندوبین نے ناظمِ ادارہ کی اس اپیل پر وعدہ کیا کہ ان میں سے ہر کوئی آئندہ سال کم از کم ایک خریدار بنانے کی کوشش کرے گا اور بزمیں اپنے اپنے ہاں پرچوں کی کھپت بڑھانے کا پروگرام بنائیں گی۔

خواتین میں سے چوہدری عبدالحمید صاحب کی بڑی صاحبزادی محترمہ تسنیم آصف نے بھی اجلاس سے خطاب فرمایا۔ ان کا کہنا تھا کہ

ہر تعصب مٹا کے سینے سے آؤ انساں کا احترام کریں

قوم کی بے حسی کا رونا روتے ہوئے انھوں نے سوال کیا کہ کیا انسان کسی ساہوکار کی تجوری میں گروی رکھا ہوا کسان ہے یا کسی جاگیردار کے کتّے کو گوشت کے ٹکڑے نہ دینے کے الزام میں موت کی سزا پانے والا مجرم یا پھر اپنے حقوق مانگنے کی پاداش میں گرم بھٹی میں جل جانے والا مزدور ہے یا کسی حکمران کے خلاف بول کر گولی کھانے والا باغی۔ خدایا ہمارے ناخدا انسانوں کو کب تک اپنے قدموں تلے روندتے رہیں گے؟

وہ بدنصیب جسے سب ضمیر کہتے ہیں سُنا ہے اس نے کہیں چھپ کے خودکشی کر لی

اجداد کی عظمتِ رفتہ کے گیت گانے والوں اور اخلاقِ حسنہ کی تبلیغ کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ؎

تخریبِ محبت آساں ہے تعمیرِ محبت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بجھانا کیا جانو؟

سماجی ٹھیکیداروں کی پیدا کردہ طبقاتی تقسیم اور اس کے اثرات سے بچنے کے لئے مصنوعی تدابیر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے متنبہ کیا کہ اس طرح کے مصنوعی چراغ جلانے سے کچھ نہ ہوگا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ؎

دلوں کو نور بخشو تاکہ گھر گھر روشنی پھیلے
چراغوں سے اگر ہو بھی تو کتنی روشنی ہوگی؟

مختلف عقیدوں کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ لوگ واہگہ کے اُس پار جنم لیں تو جن سنگھی اور اِس پار جنم لیں

تو جماعت اسلامی کہلاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ مسلمان کیوں ہیں اور یہ ہندو کیوں؟ میں اندھے عقیدوں کی قائل ہو کر اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے فرسودہ روایات کے علمبرداروں سے یہ کہنا ہے کہ اب ان کی گھسی پٹی روایات میں حقیقت کا بوجھ سہارنے کی سکت نہیں رہی۔ خدا کے لئے زندگی کو طویل اور بے موت نہ بنائیں۔ تقلید پرستوں کے چہروں کو بے نقاب کرتے ہوئے انھوں نے نوجوان نسل کی ترجمانی کرتے ہوئے ببانگِ دہل کہا کہ خود فریبی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے اس قبیلے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جنت میں جانے کی بجائے اپنے قدموں پر چل کر دوزخ میں جانا پسند کروں گی۔ میرے پاس شعور کی لازوال دستیں ہیں۔ میں انسان ہوں اور عظمتیں میری خاکِ پا سے جنم لیتی ہیں۔ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے نوجوان نسل کی نمائندہ، ہمارے مستقبل کی امید، ہماری اس بہن نے یہ کہتے ہوئے اپنی تقریر ختم کر دی کہ

عمر بھر کی داستاں یوں ختم ہونے سے رہی
رات گہری ہو چلی، اب پھر سہی، سو جائیے

تقریباً ۱۱ بجے شب یہ پُرکیف محفل برخاست ہو گئی لیکن اس سے جذبۂ شوق کی سیرابی کیسے ہو سکتی تھی؟ چنانچہ پنڈال سے اُٹھ کر خواب گاہوں میں، یہاں وہاں، مختلف حلقے بن گئے اور باہمد گر تبادلۂ خیالات کا دور شروع ہو گیا۔ کہیں مستقبل کی تعمیر کا ذکر تھا تو کہیں راہ کی مشکلات کی وضاحتیں۔ کچھ احباب ناظم ادارہ کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور کچھ قاسم نوری صاحب کے گرد جمع ــــ باہمی ربط و ضبط، اخوت و محبت، مسکراہٹوں اور قہقہوں کا ایک دلکش امتزاج تھا جو شب بھر جاری رہا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۲ء کی صبح مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کا ریکارڈ شدہ خصوصی درس بعنوان "اسلام کے مقابل اسلام" ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ حاضری بشمول خواتین ۱۲۰ کے قریب تھی۔ درس کے بعد قاسم نوری صاحب نے اپنے مختصر خطاب میں علم کے ساتھ عمل کی ضرورت پر زور دیا اور وہ سٹیج سے اُترے ہی تھے کہ کھانے کے لئے بلاوا آ گیا۔

میزبان بزم کے نمائندہ چوہدری عبدالحمید صاحب نے، جو انتہائی نقاہت کے باوجود بنفس نفیس سٹیج پر تشریف لائے، مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سٹیج سیکرٹری صاحب نے ایک قرارداد پیش کی جس میں ٹرسٹ سے کتابوں کی قیمت کم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ قرارداد اس ترمیم کے ساتھ منظور کر لی گئی کہ اجلاس میں ٹرسٹ کی نمائندگی نہ پا کر اجلاس کو دکھ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۲ پہر کی پُربہار سرگرمیوں اور سوز و گداز سے معمور یہ عظیم الشان اجتماع دن کے دو بجے اختتام پذیر ہوا۔

وداعِ وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

محمد لطیف چوہدری
ناظم ادارہ

ڈاکٹر سیّد عبدالودود

نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ

آخری قسط

تولید

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ...... (۳۵/۱۱)۔

"اور اللہ نے تمہیں بے جان مادہ سے پیدا کیا پھر نطفہ (قطرۂ آب یا تولیدی اکائی) سے پیدائش شروع ہوئی اور پھر تمہارے ازواج (جوڑے) بنا دیئے۔"

عملِ تولید کا خاکہ (PATTERN OF REPRODUCTION)

اُوپر بیان کی گئی آیت (۳۵/۱۱) میں تولیدی خاکہ کے تین ارتقائی مراحل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے مرحلے میں تخلیق کی ابتدا بے جان مادے سے ہوئی۔ دوسرے میں زندگی کی اکائیوں نے اپنے آپ کو حصّوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور تیسرے میں صنف پیدا ہو گئی اور تولید کا عمل ازواج (جوڑوں) کے باہمی ملاپ سے شروع ہو گیا۔ ان تینوں میں سے پہلا مرحلہ جس میں تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے ہوئی پہلے مفصّل بیان ہو چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تولید کی ابتدا زندگی کی نمود سے پہلے بے جان مادہ میں نیوکلی اک ایسڈ کے ذریعے شروع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد زندہ مادہ وقت اور مقام کی حدود کو پھلانگتا ہوا عملِ تولید کے ذریعے آگے بڑھتا گیا۔ اس سے پہلے ہم زندہ اجسام کی مختلف تنظیمی سطحوں کو بھی بیان کر چکے ہیں۔ ایک اونچی سطح کی تنظیم کے عملِ تولید کا انحصار اس سے نچلی سطح کی تمام تنظیموں کی تولید پر ہو۔ مثلاً ایک عضو کی تولید کا انحصار اس کے نشوز کی تولید پر ہوگا۔ نشوز کی تولید کا انحصار نئے خلیوں کی تولید پر ہوگا اور نئے

خلیوں کی تولید کا انحصار خام مال سے نئے سالمات کی پیداوار پر ہوگا۔ چنانچہ :-

سالمات کی پیداوار تمام اونچی سطح کی تنظیموں کی تولید کی بنیاد ہے۔ (MOLECULAR REPRODUCTION)

خلیے اپنے اردگرد کے ماحول سے پانی، معدنیات اور سالمات حاصل کرتے ہیں۔ خمیر جو کہ پروٹین ہوتے ہیں، شکر نشاستہ اور روغنیات کی تعمیر میں مددگار بنتے ہیں۔ نیوکلی اک ایسڈز، امائنو ایسڈز سے پروٹین بناتے ہیں اور خود اپنی مثل نئے نیوکلی اک ایسڈز تعمیر کرتے ہیں۔ خلیوں کے اندر سالمات کی تعمیر کی رفتار غذائیت کے حصول پر منحصر ہے اگر تخریب کا عمل (WEAR AND TEAR) سالمات کی تعمیر سے زیادہ تیز ہے تو خلیے کی نشوونما اور بالیدگی رُک جاتی ہے۔ سالمات کی تعمیر سے خلیے کا سائز بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک مخصوص سائز تک پہنچ کر خلیہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

خلیوں کی تقسیم کا عمل علمِ حیاتیات کی رُو سے ایک نہایت اہم چیز ہے۔ زندہ اشیاء کی تولید بنیادی طور پر خلیوں کی تقسیم ہے۔ گو اعلیٰ تنظیمی سطحوں پر یہ عمل چھپا ہوا ہے۔ خلیے کی تقسیم سے ایک اکیلا خلیہ کثیر الخلایہ بن جاتا ہے۔ کثیر الخلایہ اجسام میں گھسے ہوئے حصّے مرتب ہو جاتے ہیں اور زخم خوردہ حصّے میں تعمیر کے عمل کے بعد زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ عمل تولید کے ذریعے کثیر الخلایہ جسم میں پرانی اکائیوں میں نئی اکائیاں بھی جمع ہوتی جاتی ہیں اور صنفی خلیوں کے ذریعے بھی کثیر الخلایہ اجسام بنتے جاتے ہیں۔

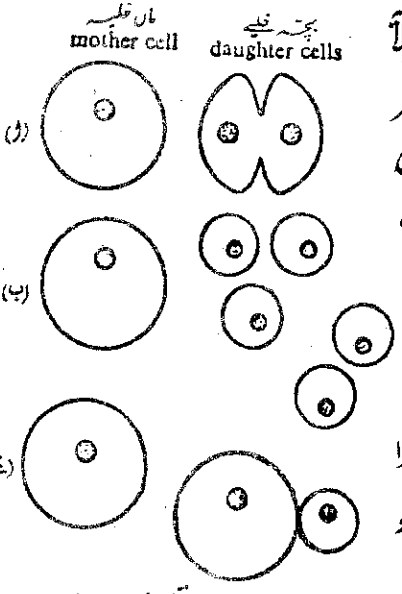

(تصویر) خلیوں کی تقسیم کے نمونے

(ا) بائی نری فیژن۔ مثنّیٰ انشقاق
(ب) ملٹی پل فیژن۔ کثیر العناصر انشقاق
(ج) بڈنگ ۔ دو بڑے چھوٹے حصّوں میں تقسیم

خلیوں کی تولید (REPRODUCTION OF CELLS)

(تصویر) زندگی کی سب سے نچلی سطحوں پر ایک (MOTHER CELL) بڑا خلیہ کئی (DAUGHTER CELLS) چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جس طرح جراثیم کے اندر ہوتا ہے۔ اس عمل کو (MULTIPLE FISSION) کثیر العناصر انشقاق کہتے ہیں لیکن باقی تمام حیوانات اور نباتات کے خلیوں میں ایک خلیہ صرف دو خلیوں میں تقسیم ہوتا ہے اسے (BINARY FISSION) مثنّیٰ انشقاق کہتے ہیں۔

خلیوں کی تقسیم ایک تیسری قسم ہے جس میں ایک بڑا خلیہ دو خلیوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں ایک بڑا اور ایک چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کو (BUDDING) یا کونپل نکلنا کہتے ہیں۔

مثنّٰی انشقاق (BINARY FISSION)

یہ خلیوں کی تقسیم کا عام قاعدہ ہے اس میں (CYTOPLASM) مائع خلیہ اور (NUCLEUS) نیوکلیس جسے مرکز عصبی یا نوات بھی کہتے ہیں. دونوں ایک ساتھ تقسیم ہوتے ہیں. خلیے کے اندر مورثوں کی تعداد دُگنی ہو جاتی ہے اور ان میں سے بالکل ایک ہی طرح کے دو سیٹ تیار ہو جاتے ہیں. اس قسم کی خلیئے کی تقسیم کو MITOSIS "مائی ٹوسس" یا خیطیت کہتے ہیں. اس میں تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے دونوں خلیے اصل خلیے کا ہو بہو عکس ہوتے ہیں.

زندہ اجسام کی تولید (REPRODUCTION OF ORGANISMS)

واحد خلیے کی تولید سالمات اور خلیے کے تمام اجزا کی تقسیم پر مشتمل ہے. کثیر الخلایہ حیوانات اور نباتات کی تولید (ASEXUAL) بلا صنف ہوتی ہے اور (SEXUAL) بذریعہ صنف بھی. بذریعہ صنف تولید دو مرحلوں میں ہوتی ہے. (۱) ایک تولیدی اکائی کی (REPRODUCTIVE UNIT) کی اپنے ماں اور باپ سے علیحدگی (۲) اور علیحدگی کے بعد تولیدی اکائی سے نئے جسم کی تعمیر.

تولید بلا صنف (ASEXUAL REPRODUCTION)

یہ والدین کے جسم سے کوئی تولیدی حصہ علیحدہ ہوئے بغیر عمل میں آتی ہے. اس قسم کا تولیدی عمل بے شمار نباتات اور چھوٹے درجے کے حیوانات میں موجود ہے. مثلاً (PARAMECIUM) پیرامیشیم ایک واحد خلیے پر مشتمل جاندار شے ہے. اس میں عملِ تولید بائی نری فژن یا مثنّٰی انشقاق کے ذریعے ہوتا ہے اور پورے کا پورا خلیہ ایک تولیدی اکائی ہے. بعض جانوروں میں تولید بلا صنف چوٹ لگنے کے بعد بھی عمل میں آتی ہے. مثلاً ایک کیچوے کو اگر درمیان میں سے کاٹ کر دو یا زیادہ حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ہر حصہ نشوونما پا کر پورا جانور بن جاتا ہے. یہاں جانور کے جسم کا حصہ تولیدی اکائی بن جاتی ہے. گویا اس کے جسم کے حصّوں میں پورا جانور بننے کی مشینری موجود ہوتی ہے.

تولید باصنف (SEXUAL REPRODUCTION)

یہ ایک عالمگیر واقعہ ہے کہ ایک نئے کثیر الخلایہ جانور یا پودے کی تولید کے لئے وہ اکائی جس کے اندر تولید کا پورا سازوسامان موجود ہو ایک واحد خلیہ ہوتا ہے. قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے نَفْسٌ وَّاحِدَةٌ کہتے ہیں. تولیدی اکائیوں کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک قسم وہ ہے جس میں خلیے MULTIPLE FISSION کثیر العناصر انشقاق کی طرز پر

تقسیم ہوتے ہیں اور ہر DAUGHTER CELL یا بعد از تقسیم خلیہ بڑھ کر جوان خلیہ بن جاتا ہے۔ اس قسم کے خلیے کو (SPORE) بَذْرَہ یا تَخْمَکْ کہتے ہیں اور یہ نباتات میں عام ہیں۔ اس قسم کی تولید کو SPORULATION یا بذریت کہتے ہیں۔

(۲) تولیدی خلیوں کی دوسری قسم وہ ہے جو براہِ راست نئے کثیر الخلایہ اجسام میں نہیں بدل سکتے۔ ان کو ایک صنفی عمل میں سے گزرنا پڑتا ہے جس میں دو خلیے مل کر ایک تولیدی اکائی بناتے ہیں۔ ان خلیوں کو GAMETES یا نسبتی خلیے کہتے ہیں۔ ان خلیوں کے ملاپ کے عمل کو FERTILISATION یا جُفتہ سازی کہتے ہیں اور ملاپ سے جو خلیہ بنتا ہے اسے ZYGOTE جفتہ کہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں تولیدی عمل کے دو مرحلے ہیں:

(۱) نر اور مادہ کے نسبتی خلیوں کا بننا۔

(۲) دونوں نسبتی خلیوں کے درمیان جُفتہ سازی کے عمل سے ایک تولیدی اکائی یا جُفتہ کا معرضِ وجود میں آنا جسے قرآن نے نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کہا ہے۔ چنانچہ یہ ارتقاوہ مرحلہ ہے۔ جہاں تولیدی عمل دو نسبتی خلیوں (یعنی نر اور مادہ) کے ملاپ سے جن کی صنف مختلف تھی شروع ہوا۔ یہ دو نسبتی خلیے ایک دوسرے کا زوج بن گئے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے ان تولیدی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہا: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ..... (۳۵/۱۱) یعنی پہلا مرحلہ وہ جہاں کیمیائی ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بے جان مادہ سے زندہ خلیے بنے۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے جہاں خلیہ یا قطرۂ آب خود تولیدی اکائی بن گیا اور اسی سے دوسرے خلیے پیدا ہونے لگے۔ تیسرا مرحلہ وہ جہاں نسبتی خلیے نر اور مادہ معرضِ وجود میں آئے اور وہ ایک دوسرے کے زوج بن گئے اور ان کی باہمی جفتہ سازی سے جفتہ خلیے بننے شروع ہو گئے۔

اُوپر تولیدی عمل کی تین شکلوں کا بیان آچکا ہے۔ یہ تینوں شکلیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں:

(۱) VEGETATIVE یعنی وہ عمل جس میں خلیے ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ، تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل واحد خلیے والے حیوانات و نباتات میں عام ہے۔ اس میں تولید کا عمل نہایت تیز ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جراثیم ہر پندرہ منٹ کے بعد تقسیم ہو کر دو جراثیم بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک AMOEBA امیبا سے ۳۳ منٹ کے بعد دو بن جاتے ہیں۔

(نوٹ: امیبا واحد خلیہ والا جانور ہے جو انسانی انتڑیوں اور جگر میں گھس کر بیماری پیدا کرتا ہے)۔

(۲) (SPORE FORMATION) بذرہ سازی ان جانداروں میں پائی جاتی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ یہ تولیدی عمل زندہ اشیا کے دور دراز علاقوں میں پھیلنے کا ذریعہ ہے۔ (SPORE) بذرہ یا تخمک پانی میں تیر کر دُور تک جا سکتا ہے۔ لیکن زمین کے اوپر اس کے باہر خول بن جاتا ہے تاکہ یہ خشک نہ ہو سکیں

اور یہ ہوا اور پرندوں کے ذریعے دُور دراز علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔

(۳) (GAMETIC REPRODUCTION) جفتہ سازی کا تولیدی عمل۔ اس میں بعض نقائص بھی ہیں۔ پہلا نقص یہ ہے کہ دو نسبتی خلیے نر اور مادہ اتفاقاً ایک دوسرے سے ملتے ہیں یعنی یہ محض اتفاق ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں نر خلیوں میں سے کونسا مادہ خلیے سے ملاپ کرتا ہے۔ چنانچہ باقی تمام ضائع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مرد اور عورت کے ملاپ سے بھی لاکھوں کی تعداد میں نر خلیے ضائع ہو جاتے ہیں اور صرف ایک نر خلیہ مادہ خلیے سے مل کر جفتہ بناتا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ نر خلیے کو مادہ خلیے تک پہنچنے کے لئے دُور فاصلے پر جانا پڑتا ہے۔ تیسرا یہ کہ جفتہ سازی کے عمل میں (WATER MEDIUM) کی ضرورت ہوتی ہے یعنی نر خلیے کو پانی میں تیر کر مادہ خلیے تک پہنچنا ہوتا ہے جس طرح انسانی مادہ منویہ میں ہے۔ پانی بعض اوقات میسّر آتا ہے اور بعض اوقات نہیں۔ لیکن ان تمام نقصانات کے مقابلے میں ایک چیز کا بڑا فائدہ ہے اور وہ ہے صِنف۔

صِنف (SEX) کی حقیقت

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صنف افزائشِ نسل کے لئے ہے۔ گو حیوانات اور نباتات میں عام طور پر صنف اور افزائشِ نسل ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت صنف، ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے وجود میں آئی۔ بیشمار چھوٹے درجہ کی زندہ اشیاء ایسی ہیں جن میں افزائشِ نسل تو ہوتی ہے لیکن ان میں صنف موجود نہیں ہے۔

اس نکتہ کو ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک جوہڑ میں پانی دیر تک کھڑا رہے تو اس پر سبز رنگ کی کائی جم جاتی ہے۔

کائی دراصل ایک ابتدائی قسم کا پودا ہے۔ کائی کے ایک تنکے میں خلیوں کی قطار ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک تنکا بناتے ہیں۔

گرمی کے موسم میں یہ خلیے ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ تقسیم ہو کر بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن سخت سردی میں نشوونما رک جاتی ہے اور پودے کے مرجھانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی کی اہمیت کے لئے اور پودے کی نسل کو مستقبل میں جاری رکھنے کے لئے دو تنکے آپس میں زوج بن کر ایک دوسرے کے پہلو میں آ جاتے ہیں۔ ایک تنکے کا ایک خلیہ دوسرے تنکے کے ایک خلیے سے ملاپ پیدا کرتا ہے اور اس کا سارا مادہ اس کے زوج میں منتقل ہو جاتا ہے۔ دونوں کے ملاپ سے ایک (CYST) تھیلی بن جاتی ہے۔ جس کے باہر ایک سخت خول پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کی سردی سے حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ سردی کے موسم میں دونوں پودے مُردہ ہو جاتے ہیں، صرف CYST باقی رہ جاتا ہے۔ جب موسم بہار آتا ہے تو اس CYST سے نیا پودا پھوٹ کر باہر آ جاتا ہے اور نئی زندگی کا آغاز

ہو جاتا ہے۔ گویا جب انفرادی طور پر دو پودے ماحول کا مقابلہ نہ کر سکے تو دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔

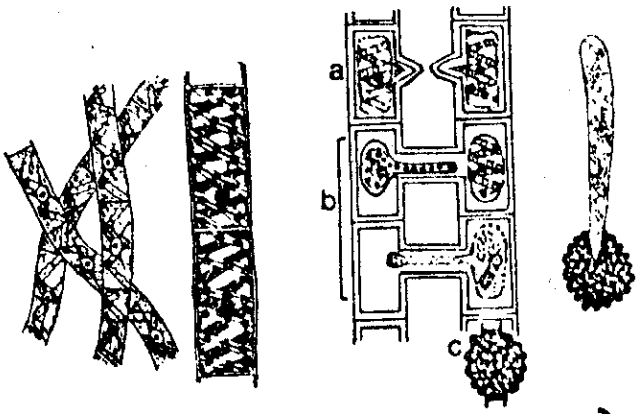

(تصویر سبز کائی میں صنف)

اب ہم صنف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ایک دوسری مثال پیش کرتے ہیں۔ (PARAMECIUM) پیرامیشیم بھی واحد خلیے پر مشتمل ایک جاندار شے ہے۔ اس میں دو خلیے ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتے بلکہ دونوں کے درمیان مادہ کا تبادلہ ہوتا ہے جو کہ دونوں خلیوں کے NUCLEI مرکزان عصبی کے مادے اور مورثوں کا تبادلہ ہے۔

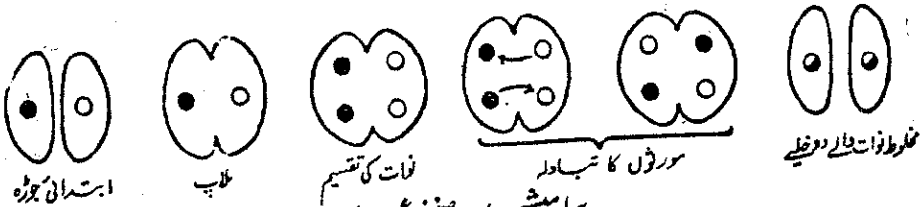

تصویر: پیرامیشیم میں صنفی عمل
مرکزان عصبی کے مادہ کا تبادلہ

چنانچہ ظاہر ہے کہ صنفی عمل اور تولید دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ گو دونوں اکثر ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ صنفی عمل ماحول کے دباؤ سے بچنے کے لئے ایک خودکار حفاظتی مشینری ہے اور یہ ان حالات میں واقع ہوتا ہے۔ جب ماحول کے دباؤ کا مقابلہ (STEADY STATE CONTROL) زندہ جسم کو مستقل رکھنے کا عمل اور تولید کا عمل نہیں کر سکتے۔ ایسے حالات ناسازگار موسم کی وجہ سے پیدا ہو سکتے ہیں جیسا کہ کائی کے تنکوں اور پیرامیسم کی مثالوں سے واضح ہے، یا بصورتِ دیگر خوراک کی کمی اور آبادی کے اضافہ سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہر جنتے میں دو ایسے نسبتی خلیوں کے مورثے جمع ہو جاتے ہیں جن کا آپس میں رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک خلیے کے اندر مورثوں کے دو مختلف سیٹ الگ الگ خلیوں کے مورثوں کی نسبت ماحول کا دباؤ بہتر طریق سے برداشت کرتے ہیں کیونکہ اس سے بقا اور استحکام کے مضمرات بڑھ جاتے ہیں۔ قرآن کریم صنفی عمل کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا:

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ..... (۱۳/۳)

"(اس نے زمین کے گول ہونے کے باوجود) اس کو اس طرح پھیلا دیا ہے (کہ تم اس پر آسانی سے چل سکو) اور اس پر پہاڑ بنا دیے اور اس سے دریاؤں کا سلسلہ جاری کر دیا اور اس میں ہر پھل کے (زوجین) جوڑے دو الگ الگ قسم کے پیدا کر دیے۔"

پھر کہا۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ (۳۱/۱۰)

"وہ بادلوں سے زمین پر مینہ برساتا ہے جس کے ذریعے ہر قسم کے اعلیٰ (زوج) جوڑے اُگتے ہیں۔"

پھر کہا۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ (۲۶/۷)

"کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کے کتنے نفیس (زوج) جوڑے اگائے ہیں۔"

اُوپر کی آیات میں زمین سے اُگنے والی نباتات کے اندر (زوجین) جوڑوں کا ذکر ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ جوڑے صرف حیوانات اور نباتات ہی کے اندر نہیں یہ ایسی چیزوں کے اندر بھی موجود ہیں جن کا تمہیں علم نہیں۔ ظاہر ہے کہ بے شمار اشیاء ایسی ہیں جن کا انسان کو علم نہیں۔ چنانچہ کہا گیا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ

اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ (۳۶/۳۶)۔

"وہ خدا بہت بلند ہے جس نے زمین کی نباتات اور خود ان کے (یعنی انسانوں کے) اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں، سب کے (ازواج) جوڑے بنائے۔

زوج

دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں اور ایک دوسرے کے مقابل ہوں زوجان کہلاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی زوج ہوتی ہے۔ زوج کے اصل معنی جوڑے کے ہیں، فرداً (اکیلا) کے خلاف۔ لہٰذا زوج اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی ساتھی ہو خواہ وہ اس کی مثل یا اس کے مقابل۔ زوجان میں سے ہر زوج دوسرے کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔

غور کیجئے کہ آج سے ۱۴۰۰ سال پیشتر وحی کے سوا اور کون بتا سکتا تھا کہ نہ صرف انسانوں اور حیوانوں کے اندر بلکہ نباتات کے اندر اور بے شمار ایسی اشیاء کے اندر جن کا انسان کو علم نہیں، جوڑے موجود ہیں جن کے باہمی ملاپ سے زندگی کی گاڑی آگے چل رہی ہے۔

ہمارا موضوع اس وقت زندہ اشیا کے اندر (SEX) صنف کا پیدا ہونا ہے۔ ورنہ قرآن اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ زوج تمام اشیا کے اندر، جاندار ہوں یا بے جان، موجود ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱/۴۹)

اور ہر چیز کے ہم نے (زوجین) جوڑے بنائے۔ تاکہ تمہیں یاد رہے۔

یعنی ہر شے کے ساتھ دوسری شے اس طرح پیدا کی کہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث بنتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بے جان چیزوں کے اندر بھی جوڑے ہیں۔ سارے کیمیائی عمل کا انحصار اسی پر ہے۔ مفردات کے باہمی تعامل سے مرکبات بنتے جاتے ہیں۔ مثلاً سوڈیم کا ایٹم اور کلورین کا ایٹم جب آمنے سامنے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا زوج بن جاتے ہیں۔ دونوں مفردات کے باہمی ملاپ سے سوڈیم کلورائیڈ (نمک) بن جاتا ہے جو کہ مرکب ہے۔

تخفیفی انشقاق (MEIOSIS)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ہر خلیے کے اندر لونیے ایک مقررہ تعداد میں ہوتے ہیں اور یہ تعداد نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی رہتی ہے۔ مثلاً نوعِ انسان کی ہر نسل میں ہر خلیے کے اندر لونیوں کی تعداد ہمیشہ ۴۶ ہو گی۔ چنانچہ جب عورت یا مرد کے نسبتی خلیوں GAMETES میں بھی یہ تعداد ہر ایک میں ۴۶ ہے تو ایسی صورت میں ایک نر نسبتی خلیہ جب مادہ نسبتی خلیے سے ملاپ کرے گا، تو اس کے بعد جو ZYGOTE جفتہ بنے گا اس میں لونیوں کی تعداد ۹۲

ہو جائے گی۔ ۴۶ نر خلیے کی طرف سے اور ۴۶ مادہ خلیے کی طرف سے اور اس سے اگلی نسل میں پھر دوگنے ہو کر ۱۸۴ ہو جائے گی۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نسل میں نوَیوں کی تعداد ایک ہی رہے گی۔ ہر نسل میں نوَیوں کے دگنا ہونے کے عمل میں ایک خاص قسم کی خلیوں کی تقسیم سدِّراہ ہوتی ہے۔ اس عمل کو MEIOSIS یا تخفیفی انشقاق کہتے ہیں۔

نر اور مادہ کے تولیدی اعضا یعنی خصیہ اور اووری میں جو خلیے ہوتے ہیں ان میں GAMETES یا نسبتی خلیہ خلیہ بننے سے پہلے پختگی کا عمل ہوتا ہے۔ اس پختگی کے عمل سے پہلے ایک خلیے میں نوَیوں کی تعداد وہی ہوتی ہے جو اس کی نوع کے لئے مخصوص ہے۔ اس تعداد کو حُنفتِ خلوی (DIPLOID NUMBER) نمبر کہتے ہیں۔ اس کی علامت 2n ہوتی ہے۔ یعنی جہاں 2n لکھا ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ اس نوع کے خلیوں کی تعداد کا اصل نمبر ہے لیکن پختگی کے عمل کے بعد نسبتی خلیوں میں یہ تعداد آدھی رہ جاتی ہے۔ اس کی علامت 1n ہوتی ہے۔ اس قسم کے خلیے کو جس میں نوَیوں کی تعداد آدھی رہ جائے یک نوَیہ خلیہ کہتے ہیں۔ مثلاً انسان میں مرد کے خصیے کے ہر خلیے میں نوَیوں کی تعداد ۴۶ ہوگی اور پختگی کے بعد جب نسبتی خلیہ بنے گا تو اس میں نوَیوں کی تعداد ۲۳ ہوگی۔ یہ 1n خلیہ ہوگا۔ اسی طرح عورت کی اووری کے خلیوں میں ہر ایک کے اندر نوَیوں کی تعداد ۴۶ ہوگی اور پختگی کے عمل کے بعد OVUM بیضہ میں نوَیوں کی تعداد ۲۳ ہوگی اور یہ بھی 1n خلیہ ہوگا۔ چنانچہ جب SPERM سپرم یا نر نسبتی خلیہ OVUM بیضہ یا مادہ نسبتی خلیہ سے ملاپ کرے گا اور دونوں کے ملنے سے جو ZYGOTE جفتہ بنے گا اس میں نوَیوں کی تعداد ۴۶ ہوگی اور یہ 2n خلیہ ہوگا۔ گویا انسانی خلیے میں نوَیوں کا مستقل نمبر ۴۶ ہے۔ صرف MEIOSIS تخفیفی انشقاق کے بعد نسبتی خلیوں میں اس کا نمبر ۲۳ ہوگا یعنی صرف نسبتی خلیے 1n ہوں گے۔

تخفیفی عمل (MEIOSIS)

اُوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ ایک جفتے کے اندر جو دو نسبتی خلیوں سے بنے گا۔ دو 1n خلیوں کا مواد جمع ہو کر اسے 2n خلیہ بنا دے گا۔ (تصویر)

MITOSIS یا BINARY MISSION مثنّیٰ انشقاق میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ خلیوں کی تقسیم کا عام قاعدہ ہے۔ اس میں تقسیم کے وقت نوَیوں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔ مثلاً انسانی خلیے کے ۴۶ نوَیے تقسیم ہو کر ۹۲ نوَیے بن جائیں گے یعنی چھیالیس چھیالیس

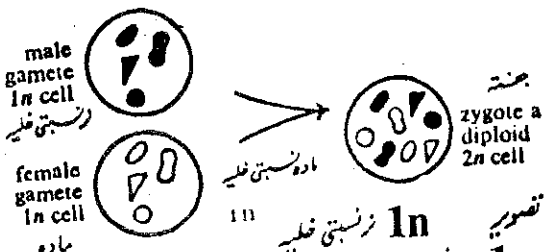

تصویر 1n نر نسبتی خلیہ 1n مادہ نسبتی خلیے سے مل کر 2n جفتہ بن گیا۔

لونیوں کے دو سیٹ۔ تقسیم کے بعد ایک سیٹ ایک دختر خلیے میں چلا جائے گا اور دوسرا سیٹ دوسرے دختر میں۔ گویا دونوں دختر خلیے ماں خلیے کا ہو بہو عکس ہوں گے۔ لیکن تخفیفی انشقاق میں پیشرو خلیے کے اندر لونیے دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ دو دو مل کر آپس میں جوڑے بنا لیتے ہیں۔

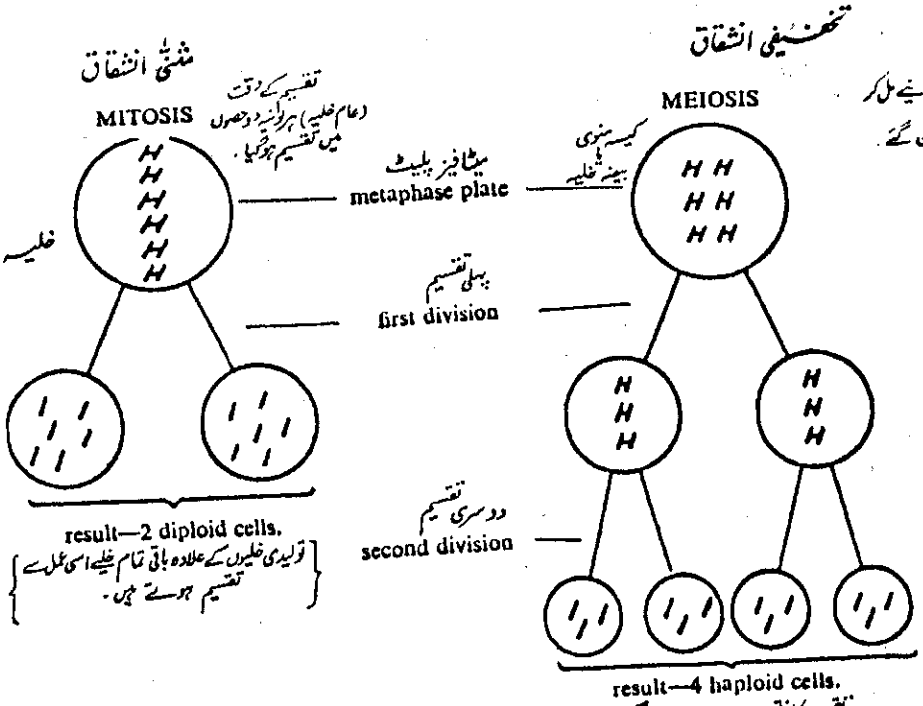

تصویر: خلیے کی تقسیم کے وقت مثنّٰی انشقاق اور تخفیفی انشقاق کا فرق

یہ تخفیفی انشقاق کا عمل صرف ان جانوروں کی نسلوں میں ہوتا ہے جن میں صنف ہوتی ہے۔ یعنی جن میں نر اور مادہ کے ملاپ سے نسل آگے بڑھتی ہے۔ جس طرح انسان کے اندر نسلاً بعد نسلٍ یہ (LIFE CYCLE) زندگی کا چکر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح دوسرے حیوانات اور نباتات میں بھی لیکن نچلی سطح کے بعض جانور ایسے بھی ہیں جن میں تخفیفی انشقاق کا عمل زندگی کے چکر میں ایک دوسرے مقام پر ہوتا ہے یعنی نسبتی خلیے بنتے وقت نہیں بلکہ جُفتہ بنتے وقت ان جانوروں کے عام خلیے ہوتے ہیں، صرف جُفتہ بنتے وقت ہوتے ہیں۔

(تصویر اگلے صفحہ پر)

آپ دیکھتے ہیں کہ دو نسبتی خلیوں، ایک نر اور ایک مادہ کے ملاپ سے جو جفتہ معرضِ وجود میں آتا ہے، یہ کتنی اہم

چیز ہے۔ ہر زندہ شے کو جس میں صنف موجود ہے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے وقت اس اسٹیج میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جفتہ کے اندر نر اور مادہ دونوں کے مورثے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ جفتہ میں دونوں قسم کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ یہ نشوونما پا کر نر بھی بن سکتا ہے اور مادہ بھی۔

(تصویر۔ نفسِ واحدۃ)

انسان میں بھی اسی کے اندر سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اسی کے اندر سے لڑکی۔ اس جفتہ کو قرآن کریم نے نفسِ واحدۃ کہا ہے:

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا .... (۳۹/۶)

"اس نے تمہیں ایک خلیے سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا زوج، جوڑا بنایا۔"

ہمارے غیر سائنسدان مفسرین میں اکثر تو وہ ہیں جو نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کا ترجمہ بابا آدم کرتے ہیں اور پھر اس کی پسلی چیر کر اس میں اس کا جوڑا (اماں حوا) نکالتے ہیں۔ لیکن جو مفسرین اب نفسِ واحدہ کے معنی واحد خلیہ بیان کرنے لگے ہیں۔ وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بے جان مادہ میں جب زندگی کی نمود ہوئی، اس وقت کہیں سمندر کے کنارے ایک واحد خلیہ پیدا ہوا جس سے آگے بڑھتے بڑھتے کثیر الخلایہ مخلوق پیدا ہوئی اور آخر میں انسان پیدا ہوا۔

یہ تصور غلط ہے۔ نہ معلوم بے جان مادہ میں بیک وقت یا مختلف اوقات میں کتنے خلیے پہلے پیدا ہوئے۔ درحقیقت زندگی کے تولیدی چکر میں ہر وہ زندہ شے جو صنف کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، ایک نفسِ واحدہ (جفتہ) سے نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

بارآور بیضے کی نشوونما اور قرآن

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بارآور بیضہ (ZYGOTE) یا جفتہ وہی شے ہے جسے قرآن کریم نے نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کہا ہے۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جفتے کے اندر ایک کے بعد دوسری نسل کو آگے بڑھانے کی پوری مشینری موجود ہے۔ نباتات اور حیوانات کا ہر فرد جو صنف (SEX) کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز یہی جفتہ ہوتا ہے۔ نئی نسل کا فرد چاہے نر ہو یا مادہ، اسی جفتے سے اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے۔ اب دیکھئے کہ (CELL THEORY) خلیوں کے نظریے کا آغاز ۱۸۳۸ء تا ۱۸۳۹ء میں ہوا اور اس سمت میں جس قدر تحقیق ہوئی ہے وہ ان سالوں کے بعد ہوئی لیکن اللہ کا اُمّی لقب رسول انسانی دنیا کو وحی کا پیغام پہنچاتے ہوئے کہتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۹۹)

"وہی تو ہے جس نے تمہیں ایک (نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ) واحد خلیے سے پیدا کیا۔ تمہارا کاروانِ زندگی ایک منزل پر ٹھہرتا ہے پھر دوسری منزل کے سپرد ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے قوانین کو اس قوم کے لئے نکھار کر بیان کر دیا ہے جو سوچ سمجھ سے کام لیتی ہے۔"

یعنی نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کا رحم مادر کے اندر ایک متعین مدت تک ٹھہرنے کا مقام ہے۔ پھر یہاں پرورش پانے کے بعد اس کی پیدائش ہوتی ہے تو پھر یہ اپنی زندگی کی اگلی منزل کے سپرد ہو جاتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا.... (۳۹/۶)

"اسی نے تم کو نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے پیدا کیا ہے پھر اس سے اس کا (زوج) جوڑا بنایا۔"

یہ بیان ہو چکا ہے کہ ZYGOTE جُفتہ یا نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کے اندر نر اور مادہ دونوں کے بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے: جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا یعنی جوڑا (زوج) اسی نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ (نوٹ: زوجہ عام لفظ ہے اور صرف عورت کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج ہے۔ دونوں ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں)۔ اب دیکھئے ہمارے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کیا کیا جدت طرازیاں کی ہیں وہ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کا ترجمہ ایک شخص کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس ایک شخص سے مراد بابا آدم ہے۔ اللہ میاں نے پہلے مٹی کا پُتلا بنایا، اس میں پھونک ماری، بابا آدم بن گیا اور پھر (جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا) اسی بابا آدم کی پسلی پیر کر اس میں سے اماں حوا نکالی۔ اب دیکھئے ہمارے مفسرین نے کائنات کی ان اربوں سالوں کے تخلیقی مراحل کو کس طرح نظر انداز کر دیا جن میں کیمیائی ارتقا کے بعد مٹی میں زندگی کی نمود ہوئی۔ پھر کاروانِ زندگی ہر ایک منزل پر ٹھہرتا ہوا اگلی منزل کے سپرد ہوتا گیا (فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ) اور اس کے بعد زندگی کی (LATEST) تازہ ترین تخلیق انسان کی شکل میں سامنے آئی جسے قرآن خَلْقًا اٰخَرَ کہتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مفسرین نے یہ آدم کی تخلیق کا غلط تخیل کہاں سے حاصل کیا؟ قرآن کریم نے مندرجہ بالا آیت (۶/۹۹) میں کہا ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ ہم نے اپنے قوانین کو اس قوم کے لئے نکھار کر بیان کر دیا ہے جو کائنات پر غور و فکر کر کے علم حاصل کرے۔ لیکن ہمارے مفسرین آیاتِ قرآنی پر خود توجہ دینے کی بجائے عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں سے انسان کے خود تراشیدہ تصورات، توہمات، روایات اور افسانوں کو جمع کر کے ان کی مدد سے قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان قوموں کی طرف اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ کے ذریعے جو وحی نازل فرمائی تھی اس کا بیشتر حصہ ان کتابوں سے غائب ہو چکا ہے اور ان میں اکثر وہی کچھ رہ گیا ہے جو ان کی اپنی تصانیف ہیں۔

قرآن کریم کا ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ... (۴/۱)

"اے نوعِ انسان اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے کی اور پھر اسی میں سے تمہارا زوج بنایا اور پھر ان دونوں میں سے کثرت سے مرد اور عورت پیدا کر کے روئے زمین پر پھیلا دیئے۔"

اس آیت میں لفظ بَثَّ آیا ہے جس کا مادہ ہے ب ث ث۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو منتشر کرنا، پھیلا دینا، صاحبِ محیط نے کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے معنی ایجاد کرنا، پیدا کرنا ہیں۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی

ہے اور کہا ہے کہ بَثّ کے معنی کسی چھپی ہوئی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سے مراد ایسی چیزوں کی نمود جو پہلے موجود نہ تھیں۔ ان معانی سے آیت کے بیان پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی (نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ) بار آور خلیے کے اندر صنف چھپی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے نشوونما پانے کے بعد اس کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر زوجان کے باہمی ملاپ سے نسلِ انسانی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ہر دفعہ جب ایک نیا انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی تخلیق کا آغاز نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے ہوتا ہے اور حیات کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلا جا رہا ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ..... (۳۱/۲۸)

"تمہاری تخلیق اور تمہاری حیاتِ نو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کی مثل ہے۔"

خلیوں کی سائنس ایسا علم ہے جس نے موجودہ صدی میں بہت وسعت اختیار کر لی ہے۔ میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اس کے چند پہلو بیان کر دیئے ہیں تاکہ لفظ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کا مفہوم واضح ہو سکے۔

بہترین
دوست وہ ہے جب تم اللہ کو یاد کرو
وہ تمہاری مدد کرے اور جب تم اللہ کو بھلا دو تو وہ یاد دلائے۔
حدیثِ نبوی

بہترین مومن وہ ہے جس کا اخلاق بلند ہو اور اہل و عیال کے
ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آتا ہو۔
حدیثِ نبوی

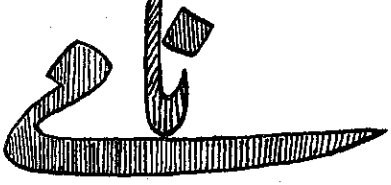

جو میرے نام آتے ہیں

(ایڈیٹر طلوعِ اسلام)

میرے محترم اور مکرّم اور معظم بھائیو!

السّلام علیکم۔ کل ستمبر کا طلوعِ اسلام ملا۔ لمعات وغیرہ مختصراً پڑھے کہ زیادہ تو پڑھنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ یوں لگا جیسے تاریکیوں میں نور ہے۔ ایسی باتیں فی زمانہ اور کون کہتا ہے۔ بڑا دل خوش ہوا اور آپ سب کے لئے دل سے دعا نکلی کہ پروردگار آپ لوگوں کو صحت کے ساتھ زندگی دے۔ اللہ آپ کے نورِ ایمان کو اور زیادہ کرے اور اللہ کرے کہ ہم اپنے کردار سے اپنے ایمان کو ثابت کریں۔ ہم باہم متحد اور متّفق ہو کر اللہ کے دیئے ہوئے پیغام کو عام کریں۔ میرے پیارے بھائی جو یہاں بھی ہیں اور اس پیغام کو پھیلانے میں ممد و معاون ہیں' میرا یہ پیغام ان سب کے لئے ہے۔ میرے وہ بھائی اور بہنیں جو طلوعِ اسلام کے لئے لکھتے ہیں اللہ ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کی کہی ہوئی باتیں اتنی مؤثر ہوں کہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائیں۔ میرے پیارے قرآنی ہم سفرو! دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اور اگر بات کرنے والے کا کردار صاف' منزّہ اور پاکیزہ ہو اور وہ بے لوث بات کر رہا ہو' تو بات دل میں بھی اُترتی ہے اور بات کرنے والے کا احترام بھی دل میں قائم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے کردار کو بلند رکھیں' آپس میں متحد ہوں' ہمارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں اور ہم ایک دوسرے کا دست و بازو بن کر مصلحتوں اور مفاد پرستیوں سے بلند اور اپنی انا کے جنگل سے نکل کر میدان میں آئیں اور کچھ کر گزریں۔ نفع و نقصان کے پیمانے بدل ڈالیں' عارضی فوائد کی بجائے ہمارے پیشِ نظر دائمی فائدہ ہو۔ اللہ کو ہر دم حاضر ناظر' ہمارے ظاہر و باطن کا جاننے والا سمجھ کر قدم اٹھائیں۔ باباجی مرحوم کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ ان کی طرح ہی دنیاوی جاذبیتوں اور دنیاوی فائدوں سے بالاتر ہو کر اس نظام کو قائم کرنے کے لئے کوشش کریں۔ اگر ہم مذہب اور اس کے غیر قرآنی عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر لیں' تو مذہب اور اس کے علمبرداروں کے لئے بھاگنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ حق میں اتنی قوت' اتنا حوصلہ اور اتنی دیوانگی ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح بے ساز و یراق دربارِ فرعون

میں جاکر باطل کا مقابلہ کر سکے۔ ڈرتا تو باطل ہے۔ حق کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد دُکھ پہنچتا ہے کہ ہم حق پر ہونے کے باوجود حق کے لئے کسی قسم کا RISK لینے کے لئے تیار نہیں۔ ارے بھائی اس راہ میں تو اگر جان بھی چلی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حق کے لئے نقصان اٹھانا اور جان دے دینا بھی تو مومن کا شیوہ ہے۔ کیوں ڈرتے ہو، کیوں اپنی جانِ عزیز کو سنبھال کر بیٹھے ہو، آگے بڑھو، حق کے علمبردار بنو اور دائمی زندگی حاصل کرلو۔ ابھی وقت ہے۔ مہلت کا وقفہ ہے۔ موت کے بعد نہیں رہے گا۔ پھر خاسر و نامراد اور شرمسار اپنے مالک کے حضور جانا ہوگا۔ بہت وقت ضائع کر دیا، مزید وقت ضائع نہ کرو۔ میدانِ عمل میں اُتر آؤ۔ اس وقت لوہا گرم ہے۔ زمانے کے تقاضے صاحبِ اقتدار لوگوں کو ہماری بات سننے پر مجبور کردیں گے۔ قوم کی تربیت باباجیؒ کے سپرد کردیں۔ وہ موت کے بعد بھی اپنے درسِ قرآن سے یہ کام بخوبی کر سکتے ہیں تربیت ہوگی، تو نظام قائم کرنے کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔

اللہ جانے جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں وہ کہہ بھی پائی ہوں یا نہیں۔ خدا کرے میری بات آپ کی سمجھ میں آجائے۔ میرے اس چھوٹے سے خط کو بہت سمجھیں کہ یہ بھی مشکل سے لکھ پائی ہوں۔ میری بینائی اجازت ہی نہیں دیتی۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔

والسّلام

آپ کی ناچیز بہن
بلند اختر ۔ کراچی

(۲)

سراجِ سخن جناب چوہدری محمد لطیف صاحب۔

ڈھیروں سلام و دُعا۔ قبول ہوں۔

مجھے آپ کی جانب سے ماہنامہ "طلوعِ اسلام" بابت ماہ اگست ۹۲ء بطور گفٹ موصول ہوا جس کو پڑھ کر ایک بہت بڑی روشنی، حقائق سے واقفیت حاصل ہوئی۔ مجھے بزرگِ محترم جناب عبداللہ ثانی صاحب کا مضمون "لِمَ تَقُولُونَ" (ایمان و عمل) بہت پسند آیا۔ جس میں انہوں نے سورۃ الصّف (۶۱:۲) کا سادہ ترجمہ "مت کہو جو کرتے نہیں ہو" کیا۔ اس کی تفسیر و تشریح میں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ اپنے نام کے مطابق لاثانی ہیں۔ ان کا حقیقت سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ "قومی اخبارات اور مغربی جمہوریت" اور باباجیؒ کا مضمون "حرام کی کمائی" ایک بے مثل و بے مثال مضمون تھا جس کو پڑھ کر ہر راشی، بدکار شخص کانپ اٹھتا ہے۔ ویسے تو سب کے سب مضامین بہت اچھے تھے لیکن "نورِ مبین" اسلام کی تشریح، بہت اچھی تھی۔ میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اپنے نور سے نورِ مبین بناکر استعمال کرے۔ آمین۔

خیر اندیش
پادری مرزا ایم اشرف بیگ چغتائی۔

ڈاکٹر سید عبدالودود

ملاوٹ

دین میں ملاوٹ کا نیا انداز

تیسری قسط

نظم و نسق کے لحاظ سے حکومت کی مختلف شکلیں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہ بھی زیرِ بحث لائے ہیں کہ اسلامی ریاست میں دستوری خاکہ کس قسم کا ہوگا۔ اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے پیشتر یہ دیکھنا ہوگا کہ مروجہ دستوری خاکے کون کون سے ہیں، ان کے مثبت اور منفی پہلو کیا ہیں اور آیا ان کو اپنی اصلی حالت میں یا کسی ترمیم کے ساتھ اسلامی ریاست میں فٹ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

قرآن حکیم ایک اسلامی مملکت کی طرزِ حکومت کے بارے میں ہدایات نہیں دیتا۔ عموماً قرآن اصولوں کی حد تک رہنمائی کرتا ہے اور (ماسوائے چند استثناء کے) تفصیل پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے اصول غیر متبدل ہیں، لیکن ان اصولوں کی حدود کے اندر متعین کی گئی تفاصیل وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

پاکستان میں قانونی ماہرین کو باہمی مشورے سے فیصلہ کرنا ہے کہ اس ملک کے لئے کون سا طرزِ حکومت موزوں ہے۔

موجودہ دور میں مروجہ اشکالِ حکومت مندرجہ ذیل ہیں۔

وحدانی اور وفاقی۔ کابینہ اور صدارتی۔ افسر شاہی اور آمریت وغیرہ۔

ہمارے قانونی ماہرین باہمی مشاورت کے ذریعے فیصلہ کرسکتے ہیں کہ آیا مندرجہ بالا حکومت کی اشکال میں سے کوئی ایک اپنی اصل یا ترمیم شدہ شکل میں پاکستان کے لئے مناسب ہوسکتی ہے۔

ذیل میں قارئین کی سہولت کے لئے حکومتوں کے خاکے مختصراً بیان کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اس بارے میں خود غور و فکر کرسکیں۔

۱۔ وحدانی طرزِ حکومت

وحدانی طرزِ حکومت میں اس کے تمام جزو باہمی پیوستہ ہوتے ہیں اور اقتدارِ اعلیٰ مرکزی حکومت کے پاس ہوتا ہے انتظامی سہولت اور دوسرے مقاصد کے لئے ملک کو سیاسی گروہوں کی مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، لیکن

تمام اختیارات مرکزی حکومت سے جاری ہوتے ہیں۔ ان ذیلی گروہ بندیوں کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ مرکزی حکومت کے پیدا کردہ ہیں اور انہیں حسبِ مرضی چلایا جا سکتا ہے۔ ان کے اختیار میں جو طاقت ہوتی ہے وہ صرف تفویض کردہ اور طابع ہوتی ہے، جسے مرکزی حکومت کے ارادے کے تحت بڑھایا، گھٹایا اور واپس لیا جا سکتا ہے۔

وحدانی طرزِ حکومت کی خوبیاں

وحدانی طرزِ حکومت مؤثر ترین حکومتی تنظیم کی نمائندگی کرتی ہے۔ حکومت کو منظم کرنے کے پورے مسئلے کو آسان بنا دیا جاتا ہے اور یہ نظام قابلِ لچک ہوتا ہے۔ ایک اچھے نظامِ حکومت کی ایک اہم خصوصیت اس کی ترمیم کرنے کی صلاحیت، اور اپنی ترتیب اور طاقت استعمال کرنے کے طریقوں کو ہم آہنگ کرنے کی استعداد ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ نئی ضروریات اور حالات اس قسم کی تبدیلی کا تقاضا کرتے ہیں۔ وحدانی طرزِ حکومت میں طاقت کی علاقائی تقسیم کا حکومت خود فیصلہ کرتی ہے۔ اس کے پاس حسبِ حال اندرونی ترتیب کی تقسیم اور طاقت کی تقسیم میں ترمیم کا مکمل اختیار ہے۔ جیسا اور جب بھی ضرورت پڑے۔

وحدانی طرزِ حکومت کی نمایاں خصوصیت اس کا اتحاد ہے۔ حکومت کی تمام قوت حاکموں کی ایک واحد جماعت کی صورت میں یکجا مرکوز ہوتی ہے اور حکومت کے تمام اجزاء باہمی پیوستگی سے حکومت کے مضبوط ڈھانچے میں سما جاتے ہیں۔ قوانین، حکمتِ عملی اور نظم و نسق میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس طرح حکومت کے تمام عضو انتظامیہ کے حل طلب مسائل پر براہِ راست عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ طاقت کے استعمال میں کوئی تصادم نہیں ہو سکتا۔ دائرۂ اختیار کی ذمہ داری کے بارے میں تصادم یا اُلجھن نہیں ہو سکتی۔ ایسے کوئی کام یا تنظیم میں دوہراپن نہیں ہو سکتا جسے فوری طور پر درست نہ کیا جا سکے۔ خارجہ حکمتِ عملی اور قومی دفاع کے میدانوں میں مرکزی حکومت کی قوت خاص طور پر ظاہر ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کی تندہی اور عمل کی پائیداری کو ظاہر کرتی ہے۔ متحد انتظامیہ دافع المرکز قوتوں کو روکتی ہے اور نظم و نسق کو انتشار سے محفوظ رکھتی ہے۔ بالآخر وحدانی طرزِ حکومت تنظیم میں سادہ ہونے کی بنا پر کم خرچ ہوتی ہے۔ اس میں سیاسی اداروں کا دوہراپن نہیں ہے۔

وحدانی طرزِ حکومت سے منسوب خامیاں

جیسا کہ پروفیسر گارنر لکھتا ہے۔ وحدانی حکومت سے متعلق واحد نقص یہ ہے کہ یہ مقامی اختراع کو دبانے کا باعث ہوتی ہے، عوامی امور میں دلچسپی کو ابھارنے کے بجائے اس کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ مزید یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حالیہ مرکزی حکومتوں کو اتنے زیادہ پیچیدہ مسائل، قومی اور بین الاقوامی، حل کرنا پڑتے ہیں کہ ان کے پاس مقامی امور کے لئے وقت ہوتا ہے اور نہ ابتدائی کارروائی کا حق۔ لہٰذا مقامی علاقے ترقی نہیں کر پاتے۔ لیکن اس تنقید کا جواز باقی نہیں رہتا جب

اختیار کی مرکزیت اور اس اختیار کے استعمال کی مرکزیت میں تمیز کی جائے۔ وحدانی طرزِ حکومت میں ایسی کوئی بات نہیں جو حکومتی اختیارات کے حقیقی استعمال میں لامرکزیت یا سیاسی ذیلی اداروں کو آزادی یا حکومتِ خود اختیاری عطا کرنے کی اجازت نہ دے۔ بایں ہمہ وحدانی حکومت ایسے چھوٹے ممالک کے لئے حد درجہ مناسب ہے جن میں جغرافیائی وحدت موجود ہو اور جو سماجی اور تہذیبی طور پر یکساں ہوں۔ یہ ایسے ملک کے لئے موزوں نہیں جس کا وسیع رقبہ ہو اور جنس کی گوناگوں نسلوں اور تہذیبوں پر مشتمل بہت بڑی آبادی ہو۔ اس تفاوت میں صرف وفاق ہی اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔

وفاقی حکومت

وفاق کا مطلب ہے معاہدہ یا سمجھوتہ۔ وفاقی حکومت مرکز جُو یا مرکز گریز قوت کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ایسی ریاستیں جو اب تک اقتدارِ اعلیٰ کی حامل اور آزاد رہی ہوں، جب رضاکارانہ طور پر متحد ہونے پر راضی ہوتی ہیں (کیونکہ وہ غیر ملکی جارحیت کی انفرادی طور پر مزاحمت کرنے میں بہت کمزور ثابت ہوتی ہیں یا اکیلے رہنے سے وہ اقتصادی طور پر پسماندہ رہتی ہیں)۔ جیسا کہ اتحاد میں طاقت ہے، تو وہ وفاقی اتحاد تشکیل دیتی ہیں۔ مائل بہ مرکز قوتیں ایسا اتحاد قائم کرتی ہیں۔ ایسے آلے کی نوعیت جس کے ذریعے ایک وفاق معرضِ وجود میں آتا ہے، ایسے معاہدے یا سمجھوتے کی طرح ہوتی ہے جو آزاد ریاستوں اور حکومت کی وہ نئی اکائی، قومی یا مرکزی، جس کی تشکیل پر وہ متفق ہوں، کے درمیان موجود ہو۔ اس طرح ایک نئی ریاست وجود میں آتی ہے جسے سابقہ خود مختار ریاستیں اپنا اقتدارِ اعلیٰ سونپ دیتی ہیں اور اس کے جزوی حصے بننے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ ایسی وفاقی ریاستیں مختلف ناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ امریکہ، آسٹریلیا اور بھارت میں ریاستیں، کینیڈا میں صوبے، سوئٹزرلینڈ میں کینٹن۔

اس اتحاد کے نتیجہ میں جو مرکزی یا قومی حکومت وجود میں آتی ہے اسے عمومی قسم کے اختیارات تفویض کئے جاتے ہیں جن کا تعلق پوری قوم سے ہوتا ہے۔ مقامی سرکار کے دوسرے امور یا وہ امور جن میں عمل کے تفاوت کی گنجائش رکھی گئی ہو، کو علاقائی حکومتوں، ریاستوں، صوبوں (جو بھی ان کا نام ہو) کے دائرۂ اختیار میں رہنے دیا جاتا ہے۔ ایسے اختیارات جو حکومت کے دو مجموعوں، مرکزی اور علاقائی، کے درمیان تقسیم کئے گئے ہوں، کی آئین حفاظت کرتا ہے اور دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے دائرۂ اختیار میں نہ تو دخل اندازی کر سکتا ہے اور نہ اس کے وجود کو ختم کر سکتا ہے۔ ردّوبدل صرف آئین میں ترمیم کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ نہ تو مرکزی حکومت کے پاس ہوتا ہے اور نہ علاقائی حکومتوں کے پاس اور نہ ہی یہ دونوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ یہ صرف ریاست کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور اور اسے صرف وہ اتھارٹی استعمال میں لاتی ہے جسے آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ چنانچہ وفاق میں اقتدار کی حامل ریاستیں غائب ہو جاتی ہیں۔ جب ان کا اقتدارِ اعلیٰ تلف کر دیا جاتا ہے اور ان کے شہری اپنے آپ کو پرانے اتباع سے عاری کرنے کے بعد

قومی اتحاد کی بنیاد پر ایک وفاقی ریاست تشکیل دیتے ہیں۔

وفاق اس وقت بھی معرضِ وجود میں آسکتا ہے جب ایک بڑے رقبے والی وحدانی ریاست، جسے تفاوت کو قابو میں رکھنے کے لئے اتحاد کی ضرورت ہے، اپنے اختیارات کو حکومت کے دو مجموعوں میں تقسیم کرتی ہے اور اپنی اکائیوں کو آئینی آزادی فراہم کرتی ہے۔ حکومت کا نیا ڈھانچہ اس طرح کا ہوتا ہے؛ مرکزی حکومت قومی اہمیت کے امور اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے اور بقیہ امور کو اکائیوں کے دائرۂ اختیار میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایسے معاملہ میں مرکز گریز قوتیں عمل کرتی ہیں اور وفاقی طرز کی حکومت کو سامنے لاتی ہیں۔ مثلاً بھارت کی حکومت۔

وجود میں آنے کا چاہے جو بھی طریقہ ہو اور اختیارات کی تقسیم کا چاہے جو بھی نظام ہو، وفاقی حکومت ایک DUAL مثنیٰ حکومت ہے جس میں آئین اختیارات کو مرکزی حکومت اور علاقائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کرتا اور بانٹتا ہے۔ وحدانی حکومت کے برعکس، وفاق میں اکائیوں کے اختیارات اصلی ہوتے ہیں نہ کہ ماخوذ۔ یہ مرکزی حکومت کے عطا کردہ نہیں ہوتے۔ بلکہ آئین کا تحفہ ہوتے ہیں اور انہیں آئینی تحفظ دیا جاتا ہے۔

وفاق کے لئے لازمی شرائط

ڈائسی DICEY کے مطابق سب سے پہلے قومیت کے لئے شدید خواہش ہونی چاہیئے، متحد ہونے کا عزم اور کسی مقصد کے لئے ایک واحد آزاد حکومت کے تحت ہونا ہی حقیقت میں وفاق کی اساس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متحدہ اکائیوں کو ایک ہونے کے خیال کے ذریعے باہم بندھا ہوا ہونا چاہیئے تاکہ اسے سیاسی طور پر مادی شکل دے سکیں۔ جب تک وہ مفادات کی ایک برادری نہ بن جائیں ان کی ایک نئی ریاست کے طور پر پیوستگی بہت مشکل ہے۔

وفاق کے لئے دوسری لازمی شرط، ڈائسی کے مطابق، یہ ہے کہ متحدہ ریاستوں کی خواہش 'ملاپ' ہونی چاہیئے۔ نہ کہ 'اتحاد'، یعنی ایک طرف متحدہ ریاستوں میں قومی اتحاد اور واحد آزاد حکومت کے تحت رہنے کی خواہش ہونی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آرزو ہونی چاہیئے کہ کم از کم بعض امور میں آزاد علاقائی حکومتیں قائم کر کے اپنی انفرادیت اور خود مختار حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ وفاق کا مقصد ان دونوں احساسات کو عمل میں لانا ہے۔

مزید برآں نہ صرف وفاق کی تمنا ہونی چاہیئے بلکہ اسے استعمال کرنے کی طاقت اور صلاحیت بھی ہونی چاہیئے۔ وہ عناصر، جو انہیں نصب العین بنانے کے لئے ان کی خواہشات و آرزوؤں کے ساتھ ان کی استعداد کا تعین کرتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں؛

(۱) قریبی میل جول کی جانب مرکزی محرکوں میں سے ایک اہم نوعی کا احساس ہے۔ جنہیں ملّ (MILL) آبادی کے درمیان

باہمی ہمدردیاں کہتا ہے۔ اس کے مطابق "اس مقصد کے لئے دستیاب ہمدردیاں وہ ہیں جو نسل، زبان، مذہب اور سب سے بڑھ کر سیاسی اداروں سے متعلق ہیں، جو کہ سیاسی مفاد کی پہچان کے احساس کی طرف حد درجہ مائل کرتی ہیں۔ بہرحال یہ عیاں ہے کہ زبان، نسل، مذہب، قومیت کی قوتیں اکٹھا ہونے کی تمنا پیدا کرنے میں مؤثر ہیں، لیکن ایسی خواہش ان لوگوں میں پیدا کی جاسکتی ہے جو ان تمام خصوصیات میں مختلف ہوں لیکن اکٹھا ہونے کا احساس رکھتے ہوں، ایک مشترکہ احساس کہ اتحاد میں طاقت ہے اور یہ طاقت سیاسی اتصال سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ سوئس لوگوں نے ایسا کیا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے باوجودیکہ زبان اور مذہب کی تفاوت کے۔ کھلی سرحدیں اور مختلف ہمسایہ ممالک کی طرف سے جارحیت کا خطرہ دفاع کی خاطر اکٹھا ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ کینیڈا میں متحد ہونے کا جذبہ لسانی اور نسلی فرق کے باوجود ابھرا۔

(۲) ایسے علاقے جو وفاق بنانا چاہتے ہوں جغرافیائی طور پر ملحق ہونے چاہئیں۔ یعنی انہیں خشکی اور پانی کے وسیع و عریض خطے علیحدہ نہ کرتے ہوں۔

(۳) اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے والے عناصر میں سے سب سے اہم سماجی اور خصوصاً سیاسی اداروں کی مماثلت ہے کیونکہ یہ اتحاد کی گنجائش بہترین انداز میں پیدا کرتی ہے۔

(۴) نہ صرف یہ کہ متحدہ اکائیوں کے سیاسی اداروں میں یکسانیت ہونی چاہیئے بلکہ انہیں آمرانہ اور استبدادی بھی نہیں ہونا چاہیے۔

(۵) ریاستوں کی وفاق میں اکٹھا ہونے کی استعداد پر ان کی جسامت بڑی حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ خاطر خواہ بات ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وفاق کے اجزاء کی جسامت اور آبادی میں برابری ہونی چاہیئے۔ اگر رقبے اور آبادی میں بہت زیادہ فرق ہو تو وفاق میں شامل اکائیاں اتحاد میں برابر کی شریک نہیں۔ جو اکائیاں جسامت اور آبادی میں بڑی ہیں اور دوسروں کی نسبت وسائل میں زیادہ خود کفیل ہیں وہ چھوٹی اکائیوں کے لئے متکبر اور ظالم ثابت ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ طاقت کے زور پر دوسروں کو ناجائز ٹھہرا سکتی ہیں اور مرکزی حکومت کے حکم کو اپنے حق میں جھکا سکتی ہیں۔ چند طاقتوں کے غلبہ کا تصور دوسروں میں بدگمانی اور باہمی اعتبار میں کمی پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اعتماد متحد ہونے کے عزم اور وفاقی حکومت کو چلانے کی استعداد کی روح ہے۔

(۶) بالآخر وفاق میں شامل ریاستوں کے پاس ایک آزاد قومی حکومت اور آزاد علاقائی حکومتوں، دونوں کو سہارا دینے کے لئے وافر معاشی وسائل ہونے چاہئیں۔ ایک وفاقی حکومت کو اپنے فرائض مناسب طور پر بجالانے کے لئے خاطر خواہ آزاد معاشی وسائل مہیا ہونے چاہئیں۔ وفاق کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ علاقائی حکومتوں کو اپنے ذمے فرائض ادا کرنے کے لئے مناسب معاشی وسائل مہیا کرے۔ اگر دستیاب وسائل آزاد علاقائی حکومتوں

کو سہارا دینے کے قابل نہیں تو عملی طور پر وفاقی حکومت ممکن نہیں چاہے جس قدر بھی ریاستیں وفاقی حکومت کی تمنا کریں اور چاہے ایک وفاقی آئین بنالیا جائے۔

مرکزی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم جو کہ وفاق کی روح ہے، میں تین عواقب شامل ہیں۔ پہلا، انتظام کو تحریری آئین کی شکل میں لانا چاہیئے۔ دوسرا، آئین کو سخت گیر ہونا چاہیئے۔ اور آخر میں سپریم کورٹ کی موجودگی۔

آئین ایک تحریری دستاویز ہونی چاہیئے اور مرکزی اور علاقائی حکومتوں پر واجب ہونا چاہیئے۔ اسے یا تو غیر متبدل ہونا چاہیئے یا آئین میں موجود متقنہ سے بالاتر کسی قوت کو اسے تبدیل کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ وفاق میں آئین کی توضیح کرنے کے اختیار کے ساتھ سپریم یا وفاقی عدالت کی حاجت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ وفاقی عدلیہ دو اہم خدمات انجام دیتی ہے:

(۱) یہ مرکزی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان یا دو علاقائی حکومتوں کے درمیان پیدا ہونے والے دائرہ اختیار کے نزاع کا فیصلہ کرتی ہے۔

(۲) یہ مختلف حکومتوں کو ان کے دائرہ اختیار میں رکھتی ہے تاکہ ان میں سے کوئی دوسرے کے حلقۂ اختیار میں مداخلت نہ کر سکے۔

وفاقی حکومت کے فوائد

چھوٹی آزاد ریاستیں جدید حریف ریاستوں کے درمیان اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں اور انہیں وفاقی طرزِ حکومت میں ایک معقول بدل مل جاتا ہے جو ان کی سیاسی خود مختاری برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اتحاد کی منفعتیں بھی بخشتا ہے۔ وفاق اصولاً اتحاد اور تفاوت کا مجموعہ ہے۔ اس کی حاجت خصوصاً وسیع علاقوں کے حامل ممالک کو پیش آتی ہے یا جن میں بہت گہرے سماجی، تہذیبی، مذہبی یا لسانی اختلافات پائے جاتے ہوں۔ وفاقی حکومت واحد مطلق العنانی کو ابھرنے سے باز رکھتی ہے، افسر شاہی کے اختیارات کو بے جا پھیلنے سے روکتی ہے اور لوگوں کی سیاسی آزادی کو محفوظ رکھتی ہے۔ کسی دوسری طرزِ حکومت کی نسبت طاقت ور وفاق اختیارات کے ناجائز استعمال کو بآسانی روکتا ہے۔ فرائض کی علاقائی تقسیم مرکزی حکومت کو بہت سے تکلیف دہ کاموں سے نجات دلاتی ہے اور مرکز میں قانون سازی اور انتظامی کاموں کی افراط سے بھی چھٹکارا دیتی ہے۔

وفاقی حکومت کی خامیاں

(۱) وفاقی حکومت کی آئین ساز مجلس کو نہ صرف حکومتوں کے دو خاکے فراہم کرنے کا

بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ مکمل حکومتی اختیارات کی تقسیم کی صورت کا بھی تعین کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام اس قدر مشکل ہے کہ ایک ہی وقت میں ان کی تسلی بخش انجام دہی ناممکن ہے کیونکہ یہ قومی زندگی کو مختلف شعبوں میں منقسم کرنے کے مترادف ہے۔ جو کام پہلے بے خوف و خطر علیحدہ اکائیوں کی تحویل میں چھوڑا جا سکتا تھا، وہ وقت گزرنے کے ساتھ اور بدلے ہوئے حالات کے تحت قومی ضابطے اور فیصلے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ دونوں حکومتوں کے دائرۂ اختیار سے متعلق تلخ مقابلوں کو جنم دیتا ہے۔ مرکزی حکومت اسے مقامی حکومتوں کی معقول ہم آہنگی ایک مسلسل وجہِ پریشانی بن جاتی ہے اور بغاوت کا خطرہ یا فرقہ بندی کی تشکیل ہر وقت موجود رہتی ہے۔

(۲) اس کے بعد، وفاقی حکومت کی لازمی شرط آئین کی فضیلت ہے جو ایک تحریری اور سخت آئین کی دلالت کرتا ہے۔ اگر آئین میں کوئی تبدیلی مطلوب ہو تو یہ آئین میں ترمیم کے ذریعے کی جا سکتی ہے جیسا کہ قانون تجویز کرتا ہے نہ کہ دونوں حکومتی مجموعوں کے یک طرفہ عمل سے۔ لیکن آئین میں ترمیم کے عمل کا پیچیدہ اور پیچ دار ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ جب بھی اور جیسے بھی لوگوں اور ملک کی ضروریات مطالبہ کریں ویسے ہی نتائج حاصل کئے جا سکیں۔

(۳) وفاق میں حکومت کے اختیارات مرکزی حکومت کے علاوہ اپنے ہی عہدہ داران کے درمیان تقسیم کئے جاتے ہیں جتنے بڑے بڑے سیاسی گروہ ہوتے ہیں حکومت کے آلۂ کار ایک اچھی طرح سے مربوط انتظامی مشینری کے حصے ہونے کے بجائے بہت سے انتظامی نظاموں کے اجزاء ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ رتبے کے لحاظ سے ہم پلہ ہوتے ہیں اس لئے رفاہِ عامہ کے لئے یکساں حکمتِ عملی صرف ایسی رضاکارانہ حکومت ہی حاصل کر سکتی ہے جس میں سب ایک جیسا تعاون کریں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے حاصل کرنا ناممکن نہیں تو اکثر دشوار ضرور ہوتا ہے۔ وفاق کے تمام اجزاء کے مخصوص مفادات ایک سے نہیں ہوتے اور ہر ایک اکائی ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنا پسند کرتی ہے جو ریاست بحیثیتِ کُل کے مفادات کی بجائے اپنے مفادات کی طرف مائل نظر آتی ہے اس سے بھی زیادہ قابلِ فکر بات یہ ہے کہ مفادات کی یہ ناآلفاقی بہت سی اکائیوں کو آپس میں سخت متصادم کر سکتی ہے یا اجتماعی طور پر مرکزی حکومت سے ٹکرا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ جب مفادات کا کوئی جھگڑا نہ بھی ہو، اگر کوئی کام واحد حکم کے تحت نہ ہو تو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

(۴) خارجہ امور کی بجاآوری میں یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ وفاقی حکومت خلقی کمزوری اور بے ربطگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خصوصاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تجربے نے یہ دکھایا ہے کہ وفاقی اتحاد کے انفرادی ارکان، افراد اور املاک کے حقوق پر اپنے فاضل اختیارات کے زور پر قومی حکومت کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ

میں رہائش پذیر غیر ملکیوں سے متعلق اپنے معاہدوں کو نافذ کرانے میں مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ جب خارجی تعلقات میں اندرونی اختلافات در آئیں، تو قومی حکومت اپنا وقار کھو دیتی ہے۔ ایک غیر مستقل خارجہ حکمتِ عملی گوناگوں مسائل کا راستہ دکھاتی ہے۔ اسی طرح جنگ کے زمانے میں بعض اوقات وفاقی حکومت فیصلے کی مستعدی اور عمل کی ثابت قدمی سے عاری پائی جاتی ہے، جن کی ایسے نازک وقت میں اشد ضرورت ہوتی ہے۔ مالی طور پر وفاقی حکومت گراں ہے کیونکہ انتظامی مشینری اور طریقۂ کار میں کافی حد تک دوہراپن پایا جاتا ہے۔ یہ وقت اور قوت کے زیاں کا باعث ہوتی ہے کیونکہ یہ بڑی حد تک سیاسی اور انتظامی تبادلۂ خیال پر منحصر ہوتی ہے تاکہ قانون کی یکسانیت اور اس کی مناسب انتظامی بجاآوری کا یقین کرایا جا سکے۔ بہرحال وفاق کے نظریہ اور عمل میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ درحقیقت وہ تمام ریاستیں جنہوں نے وفاقی نظامِ حکومت اپنایا ان میں اختیارات کی آئینی تقسیم سے منتج ہونے والے ناموافق حالات کا توڑ کرنے کے لئے ایک مستحکم تحریک موجود رہی ہے جو بتدریج مرکزی حکومت کے اختیارات کو بڑھانے کا باعث ہے۔

کابینہ اور صدارتی حکومتیں

جدید وفاقی حکومتیں مزید کابینہ اور صدارتی حکومتوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اوّل الذکر کو پارلیمانی یا جوابدہ حکومت کا نام بھی دیا جاتا ہے اور مؤخر الذکر کو غیر پارلیمانی یا مجلسی حکومت کہا جاتا ہے۔ یہ تقسیم اس اصول کی بنیاد پر کی گئی ہے جو انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان تعلقات کو قابو میں رکھتا ہے۔ اگر ان دونوں محکموں کو یکجا کر دیا جائے اور یکساں لوگوں کے اختیار کے تحت مربوط کر دیا جائے تاکہ وہ موافقت سے کام کر سکیں تو ایسے نظامِ حکومت کو کابینہ یا پارلیمانی کہتے ہیں۔ یہ جوابدہ ہے کیونکہ کابینہ مقننہ کو سیاسی حکمتِ عملیوں اور اعمال کے لئے جوابدہ ہوتی ہے اور یہ اس وقت تک برسرِ اقتدار رہتی ہے جب تک یہ مقننہ کے اعتماد کو قائم رکھتی ہے۔ اگر انتظامی اور قانون ساز محکمے ایک دوسرے سے بڑی حد تک آزاد ہوں، لیکن طاقت کو پابند کرنے کے لئے ہر ایک دوسرے کے اختیارات پر رکاوٹ رکھتے ہوں، تو ایسا نظامِ حکومت صدارتی ہوتا ہے۔ اس میں انتظامیہ کا سربراہ اپنے عہدے کی معیاد کے لحاظ سے آئینی طور پر آزاد ہوتا ہے اور اسے اپنی سیاسی حکمتِ عملیوں کے لئے جوابدہ نہیں ہونا پڑتا۔ چنانچہ یہ غیر پارلیمانی یا غیر جوابدہ ہے۔

کابینہ حکومت

اس میں سب سے بڑا عہدہ دار ریاست کا سربراہ ہوتا ہے، چاہے وہ موروثی بادشاہ ہو۔ جیسا کہ انگلستان

میں یا بھارت کے صدر کی طرح جو معینہ سالوں کے لئے منتخب ہوتا ہے اور برائے نام اختیارات رکھتا ہے۔ قانوناً اسے وہ تمام اختیارات اور استحقاق حاصل ہوتے ہیں جو آئین اسے مرحمت کرتا ہے، لیکن عملاً وہ ان میں سے کوئی بھی استعمال نہیں کرتا۔ اصل انتظامی طاقت کابینہ کے پاس ہوتی ہے۔

کابینہ حکومت کی خامیاں

کابینہ نظام کے بہت سے عملی فوائد کے باوجود اس کے خلاف چند اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ انتظامی اور قانون ساز فرائض کا لوگوں کے ایک ہی گروہ میں ارتکاز جبر کی طرف لے جاتا ہے۔ مزید برآں وزراء قانونی کاروائیاں تیار کرنے اور انہیں پارلیمنٹ سے گزارنے کے کام سے اپنے انتظامی فرائض سے توجہ ہٹانے کے متوجب ہوتے ہیں، جبکہ پارلیمنٹ موجودہ دل چسپ انتظامی امور بالخصوص امورِ خارجہ میں انہماک کی صورت میں قانون سازی سے عدم توجہی کی طرف مائل ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، یہ کہا جاتا ہے کہ عملی تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ریاست کی فلاح و بہبود کے لئے انتظامی اور قانون ساز اختیارات کا اشتراک لازم ہے۔ یہ ادارے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کئے جا سکتے۔

مزید یہ نکتہ اجاگر کیا جاتا ہے کہ کابینہ حکومت ناپائیدار ہوتی ہے۔ اس کی کوئی معین زندگی نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک برسرِ اقتدار رہتی ہے جب تک کہ پارلیمانی اکثریت اسے محفوظ رکھتی ہے جو کہ نمائندوں کی بے ہودگیوں کے تابع ہوتی ہے، خصوصاً جب نمائندوں کے ایوان میں غالب اکثریت یا محدود ہو یا باہمی ملاپ میں ناقص ہو اور مؤخر الذکر معاملے میں ایوان میں ذاتی سازشوں کی مدد سے جماعتوں کا نیا اتحاد اسے الجھن میں ڈالنے کا متوجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اتحاد کا موقع مہارت کے ساتھ چنا جائے تاکہ حال ہی میں قائم کی گئی اکثریت مخالف سمت میں نہ تبدیل ہو جائے۔ اقتدار کی معیاد میں غیر یقینی حاکم جماعت کو دور اندیش اور یک رنگ حکمت عملی اختیار کرنے کی طرف مائل نہیں کرتی۔ بالآخر کابینہ حکومت پر قومی بحران اور ناگہانی صورت میں بروقت فیصلہ نہ کرنے اور فوری عمل میں تاخیر کا الزام لگایا جاتا ہے۔

صدارتی طرزِ حکومت

کابینہ اور صدارتی طرزِ حکومت اپنی خاصیت میں دونوں نمائندہ ہوتی ہیں، لیکن اوّل صورت میں انتظامیہ کی مقننہ کو جوابدہی لازمی شرط ہے جب کہ دوسری صورت میں انتظامیہ مقننہ سے آئینی طور پر آزاد ہے۔ صدارتی نظام کے تحت مقننہ اور انتظامیہ حکومت کے دو واضح محکمے ہیں، انتظامیہ نہ تو اپنے عوام سے متعلق اعمال کے بارے میں مقننہ کو

جوابدہ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ برسرِ اقتدار رہنے کے لئے اس پر انحصار کرتی ہے۔ منتظمِ اعلیٰ مملکت کا سربراہ، صدر کابینہ حکومت کے برعکس، قانون کی حیثیت سے بھی اور حقیقت میں بھی اصل ناظم ہوتا ہے اور ایسی طاقت آئین کا براہِ راست عطیہ ہوتی ہے۔ منتظمِ اعلیٰ تمام وزراء کو اپنا نائب مقرر کرتا ہے اور اس طرح انہیں پارلیمانی حکومت میں وزراء کی زیادہ خود مختار حیثیت سے محروم رکھتا ہے۔ انہیں مقننہ تک کوئی رسائی نہیں ہوتی، وہ صرف صدر کو جوابدہ ہوتے ہیں اور حکومت کی حکمتِ عملی وہی ہوتی ہے جو سربراہِ مملکت کی ہوتی ہے۔ صدارتی طرزِ حکومت میں مقننہ کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی معیادِ زندگی کو خود پورا کرتی ہے۔

صدارتی طرزِ حکومت کے اوصاف

اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ بغیر جوابدہ ہونے کے یہ نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ صدر عوام کا منتخب کردہ نمائندہ ہوتا ہے لیکن اس کے عہدے کی مدت مقننہ کے بے ثبات ارادے پر منحصر نہیں ہوتی۔ اقتدار کی معینہ معیاد حکمتِ عملی کے زیادہ لمبے تسلسل اور انتظامیہ کی ثابت قدمی کو ظاہر کرتی ہے۔ حکومت کی حکمتِ عملی کو بغیر کسی تعطل کے خوف سے کامیابی کے ساتھ پورا کیا جاسکتا ہے۔ صدارتی طرزِ حکومت کی بلند پایہ صفت، یہ حقیقت ہے کہ یہ جمہوری ترتیب کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے ایک مستحکم انتظامیہ کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ میں مستعدی، قوت اور اختراعی اقدام کا حوصلہ، نظم و نسق کی یگانگت، فیصلہ کی تیزی اور مقننہ حکمتِ عملی جس کا ہر قسم کی ہنگامی حالت تقاضا کرتی ہے، صدارتی طرزِ حکومت ہی میں بہتر طریق سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ سربراہِ مملکت کی مسلح افواج کا اعلیٰ پالیسی ساز اور امیرِ اعلیٰ ہوتا ہے۔

صدارتی نظام جماعتی پاسداری کا لحاظ کئے بغیر محکموں کو چلانے کے لئے ماہرین کی تقرری ممکن بناتا ہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ صدارتی طرزِ حکومت ایسے ممالک کے لئے نہایت موزوں ہے جہاں گوناگوں مصلحتوں کے ساتھ مختلف برادریاں آباد ہوں۔

صدارتی طرزِ حکومت کے نقائص

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ انتظامی اور قانون ساز محکموں کے درمیان اختیارات تقسیم ہونے کے ساتھ اور مناسب ربط کے کسی ذرائع کے بغیر، ایسے ضروری معاملات جو عاجلانہ تصفیہ کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے کسی مفاہمت پر پہنچنے میں ہمیشہ بے حد تاخیر ہوتی ہے۔ حکومت کی ایک شاخ ایک حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہو سکتی ہے جب کہ دوسری کوئی مختلف حکمتِ عملی اختیار کر سکتی ہے، خصوصاً جب انتظامیہ کسی ایک جماعت سے تعلق رکھتی ہے اور قانون ساز

اکثریت کسی دوسری جماعت سے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ صدارتی طرزِ حکومت میں انتظامیہ کی طرف سے قانون سازی میں بلاواسطہ ابتدائی قدم اٹھانے کی کمی ایک اہم نقص ہے۔ انتظامیہ کا مرکزی کام قانون سازی ہوتا ہے اور قانون سازی اس کی ہدایات کے تابع عمل نہیں کرتی۔ چنانچہ پیوستگی وجود میں نہیں آتی اور جماعتی وفاداریاں جو انتظامیہ اور مقننہ کو پابند رکھتی ہیں ایک مجموعی حکمتِ عملی کے لئے بہت کمزور ثابت ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں صدارتی طرزِ حکومت کو جابرانہ، غیر ذمہ دار اور خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔ جب صدر کو ایک مرتبہ منتخب کر لیا جاتا ہے تو قوم کو اسے برقرار رکھنا پڑتا ہے چاہے وہ اس کی حکمتِ عملی کو پسند کریں یا نہ پسند۔ وہ جابر بن سکتا ہے اور یہاں تک کہ مطلق العنان ہونے کی حد تک بگڑ سکتا ہے۔ چونکہ اس کا اقتدار معین وقت کے لئے ہوتا ہے اس لئے اُسے ہٹایا نہیں جا سکتا۔

لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدارتی نظام اپنی حدود و قیود کے باوجود بڑی توانائی کے ساتھ چلتا رہا ہے جب بھی کسی غیر معمولی بحران میں بنیادی اتحاد کی ضرورت پیش آئی سیاست دانی اور حب الوطنی نے اسے کما حقہ پورا کیا۔ بہر صورت لاطینی امریکہ کے ممالک، فلپائن اور جنوبی کوریا میں صدارتی نظام بجا طور پر نہیں چل سکا۔

افسر شاہی حکومت

افسر شاہی ایسی حکومت کو کہا جاتا ہے جس کی انتظامیہ مستقل عہدے داروں کو تفویض کی جاتی ہے وہ مستقل سول (شہری) انتظامیہ کو تشکیل دیتے ہیں اور مقابلے کے امتحان یا نامزدگی کے بعد ملازمتوں میں بھرتی ہوتے ہیں انہیں عہدے کا استحکام میسر ہوتا ہے اور اس وقت تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں جب تک نیک نامی کمائیں یا وظیفے پر سبکدوش ہو جائیں۔ ان کی ملازمت میں ترقی کسی قدر مدتِ ملازمت میں فوقیت اور کسی قدر قابلیت پر موقوف ہوتی ہے۔ افسر شاہی حکومت نہ تو نمائندہ ہوتی ہے اور نہ جوابدہ۔ لہٰذا عوامی رائے کو بھی جوابدہ نہیں ہوتی۔ افسر شاہی حکومت کی سب سے زیادہ جانی پہچانی مثال ۱۹۱۹ء سے پہلے کی ہندوستان پر حکومتِ برطانیہ تھی۔

افسر شاہی کی خوبیاں

اس کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اہم عہدے ان افسروں کے اختیار میں دیئے جاتے ہیں جو بہت زیادہ باصلاحیت اور ماہر ہوں اور مشاق علم رکھتے ہوں۔ وہ حکومت کرنے کے فن میں خصوصی تربیت حاصل کرتے ہیں اور ہدایات کے سخت گیر مجموعۂ قوانین کا احترام کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عوامی حکومت سے زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ عموماً انتظامی

منصب داروں کے درمیان نظم و ضبط کا جذبہ پروان چڑھتا ہے جیسا کہ ایک باقاعدہ فوج میں پایا جاتا ہے۔

افسر شاہی کی خامیاں

افسر شاہی کی اہم خامیاں کنٹرول اور نگرانی کی مرکزیت، سرخ فیتا، ضابطے کی سخت پابندی، رازداری اور ملازمت کے لئے بے جا تحفظات وغیرہ ہیں۔ ایسی حکومت نہ تو جوابدہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی ذمہ دار۔ وہ جو اختیارات استعمال کرتے ہیں، لوگوں کی ضروریات سے قطع نظر دفتری ضابطوں اور سابقہ مثالوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یہ اپنے مقصد میں قدامت پسند ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے پاس نہ تو لوگوں کا حال معلوم کرنے کے اسباب ہوتے ہیں اور نہ ہی عوامی مطالبے کے مطابق اپنی حکمتِ عملی کو ترتیب دینے کا میلان پایا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر انہیں حقیقت کے بجائے ہیئت سے غرض ہوتی ہے۔ فوری ضرورت کی افسر شاہی میں کوئی جگہ نہیں۔ انتظامیہ کی ہر ایک تفصیل کو "معقول راستے" کے مقرر طریقے سے مشین کی طرح گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ محکمے کے سربراہ تک پہنچتی ہے اور فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ادنیٰ معاملات کو آخر کار مکمل کرنے میں بھی سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ وقت اور قومی دولت کے غیر ضروری زیاں کا باعث ہوتا ہے۔

افسر شاہی کا مطلب ایک مؤثر حکومت ہو سکتا ہے، لیکن ایک اچھی حکومت کا واحد معیار کارگردگی ہی نہیں ہوتا۔ ایک اچھی حکومت ہمیشہ لوگوں میں خود اعتمادی، حب الوطنی، وفاداری اور حکومت میں دلچسپی کو اکسانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ شہریوں کی سیاسی تعلیم و تربیت کا تقاضا کرتی ہے۔ حکام اپنے آپ کو عوامی رائے کا امین سمجھتے ہیں اور عوام کے کام کرتے وقت لوگوں کی ضروریات سے راہنمائی اور اثر قبول کرتے ہیں۔ افسر شاہی ان سب کا انکار ہے۔ اس لئے چاہے اس کی جو بھی خوبیاں ہوں یہ خود کار حاکمیت کا بدل نہیں ہو سکتی۔

آمریت

آمریت بطور حکومت کوئی چیز نہیں۔ روم کی جمہوری سلطنت میں یہ ایک تسلیم شدہ ادارہ تھی جہاں حکومت کے اختیارات دو صدور جنہیں قونصل کہا جاتا تھا میں مرتکز کئے جاتے تھے۔ ناگہانی حالات میں اہل روم ایک مطلق العنان حاکم کو متعین کرتے جسے قونصلوں پر برتری حاصل ہوتی۔ اسے بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سب سے اعلیٰ اختیارات بخشے جاتے۔ لیکن رومی آمریت بحران سے نمٹنے کی ایک عارضی تدبیر تھی اور جب بحران ٹل جاتا تو اسے خارج کر دیا جاتا۔ مزید برآں آمر کو ایک قانونی عمل سے منتخب کیا جاتا اس عہد کے ساتھ کہ اپنی طاقت کے استعمال کو مستقل اتھارٹی کی جانچ پڑتال کے تابع رکھنا ہوگا۔

آمریت کی یہ شکل جدید آمروں سے مختلف ہے جو موجودہ صدی میں سامنے آئے ہیں۔ جدید آمر ریاست کو قومی ناگہانی صورت میں چلانے کے لئے محدود مدت کے لئے کسی قانونی کارروائی کے ذریعے منتخب نہیں ہوتے۔ وہ فوری انقلاب کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ ان کے سیاسی عمل دخل کا معیار قوت ہے اور وہ اس وقت تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں جب تک طاقت انہیں قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ اپنے سوا کسی دوسرے حاملِ اختیار کو جوابدہ نہیں ہوتے۔ درحقیقت مملکت کی پوری طاقت واحد شخص میں مرتکز ہو جاتی ہے اور وہ خود ایک مجسم ریاست بن جاتا ہے۔

جدید آمریت کے دو اہم اصول یہ ہیں:

(۱) حاکم اور محکوم کے درمیان واضح امتیاز پیدا کرنا اور

(۲) ریاست اور حکومت کے درمیان فرق کو دھندلا کرنا۔ حاکم ہی ریاست بن جاتا ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا آمر کی مملکت احاطہ نہ کرتی ہو۔

(جاری ہے)

عبداللہ ثانی

اوسلو نامہ

کرۂ ارض کے شمال میں واقع ملک ناروے کا صدر مقام اوسلو ہے۔ پورے ملک کی آبادی چالیس لاکھ ہے۔ ہر انسان کا "کل" محفوظ ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی سامانِ رزق سے بے فکر قرار دے دیا جاتا ہے۔ بالغ ہوتے ہی روزگار الاؤنس کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خودکشی کی شرح بڑوں سے کہیں زیادہ بچوں میں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی تفصیل آئندہ پیش کی جائے گی۔

دوسری طرف فکرِ قرآنی سے وابستہ احباب دن رات پروانہ وار خداوندِ لم یزل کی طرف سے بنی نوع انسان کے نام آخری پیغامِ رشد و ہدایت گھر گھر پہنچانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہاں کی بزم نے راقم کو ایک ایسے مقام پر آنے کی دعوت دی جہاں کہتے ہیں کہ دنیا ختم ہو جاتی ہے اور یہی اس کا آخری کنارہ ہے۔ سردی ہو یا گرمی ہزاروں کی تعداد میں سیّاح "END OF THE WORLD" دیکھنے آتے ہیں۔ اپنے سفرنامہ کی تفصیل تو آئندہ شماروں میں عرض کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ سرِدست میں نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام جناب خادم حسین، روحِ رواں محترم منظور احمد خاں (یاد رہے اپنے نام کی خصوصیت کے اعتبار سے دونوں کو پورا اوسلو جانتا ہے) محترم طاہر سلیم، محترم امجد رانا صاحب، محترم رامے صاحب، محترم اور بزرگ شخصیت بشیر بٹالوی صاحب، محترم آفتاب صاحب، محترم ارشد صاحب، محترم نعیم قریشی صاحب اور کئی دوسرے احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے فکرِ قرآنی کو عام کرنے کے لئے راقم کو کئی مقامات پر خطاب کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ میں نے وہاں کیا دیکھا؟ کیا سُنا؟ کیا محسوس کیا؟ کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے کئی سوالات کے جواب آئندہ شماروں میں پیشِ خدمت کر سکوں گا۔ بعد ازاں وہاں سے لندن کے لئے روانہ ہوا۔ لندن میں محترم افضل صاحب، محترم راجہ محمد یونس صاحب اور محترم فرحت صاحب نے جس خلوص اور محبت کا اظہار کیا اس کا بھی تذکرہ ہوگا۔ ایک منفرد چیز جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ پاکستان میں مفکرِ قرآن پرویزؒ کو لوگ ابھی اتنا نہیں جانتے جتنا باہر جانتے ہیں۔ میں انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی فوٹو سیٹ بھی لایا ہوں جن میں پرویزؒ کا کن الفاظ میں ذکر ہے۔ مکہ کی

عبدالعزیز یونیورسٹی کے ڈائریکٹر جنرل کا خط اے۔ ایس۔ کے جمول ساؤتھ افریکہ کے ایک مصنف کے نام، جنہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "بائیبل خدا کا کلام یا انسان کا" مفکرِ قرآن کے نام منسوب کی تھی، پر اعتراض کیا اور پھر مصنف موصوف نے جو شاہکار جواب دیا ہے اس کا بھی ذکر ہوگا۔ باہر کی دنیا میں پرویز پر تحقیق کا کام جاری ہے۔ یہاں ابھی یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ وہ منکرِ حدیث تھا یا مفکرِ قرآن۔

آتے ہی سیاسی جماعتوں والے مقدمہ کی پیروی میں مصروف ہو گیا ہوں۔ جس کی اب باقاعدہ سماعت ۸۔ نومبر کو ہوگی۔ طلوعِ اسلام سے وابستہ محترم راجہ محمد عادل صاحب نے وفاقی شرعی عدالت میں اسلام میں سیاسی جماعتوں کے وجود کو چیلنج کیا ہے۔ عدالت نے کئی سماعتوں کے بعد اب بڑے وفاقی شرعی عدالت کے بنچ کی تشکیل کا حکم دیا ہے اور سیاسی جماعتوں کے علاوہ ملک میں موجود تمام دانشوروں، پروفیسروں، علماء، وکلاء، سیاسی رہنماؤں، چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرلوں اور اٹارنی جنرل کے نام نوٹس جاری کر دیا ہے۔

امید ہے جنوری ۱۹۹۳ء کے پرچہ میں ان تمام حقائق کو منظرِ عام پر لایا جائے گا جو راقم نے دیارِ غیر میں دیکھا اور محسوس کیا۔ البتہ ایک اہم اطلاع سے قارئین کو مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مرتبہ لندن میں تین عیدیں منائی گئی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور ایسا ہونے کے بعد وہاں کے مسلمان دانشوروں نے چاند پر تحقیق شروع کر دی ہے۔ اس کا انجام کیا نظر آرہا ہے؟ یہ تفصیل بھی سب سے آخر میں آئے گی۔ اس وقت صرف ایک خط قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو محترم آفتاب صاحب (اوسلو) کے نام گجرات کے ایک مولوی صاحب سید خالد محمود نے بھیجا تھا۔ یاد رہے کہ محترم آفتاب صاحب نے اوسلو سے ان کے نام مفکرِ قرآن پرویز کی چند کتابیں ارسال کی تھیں۔ اس کے تاثرات خود پڑھیں۔ افسوس یہ ہے کہ فکرِ قرآنی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود "احبار اور رھبان" ہیں یعنی پیشوایانِ شریعت اور رہبانِ طریقت۔ سورہ توبہ کی آیت نمبر ۳۴ کا مفہوم کچھ یوں ہے:

مفہوم: "ان کے علماء و مشائخ میں سے جنہیں یہ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ، جھوٹ اور فریب سے، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں، (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے)۔

اے رسول! تم ان کے، ان علماء و مشائخ کو اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو جو (ان کی خود ساختہ شریعت کی آڑ میں) نظامِ سرمایہ داری کو منشائے خداوندی کے عین مطابق سمجھ کر سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے، الم انگیز عذاب کی خبر سنا دو۔"

گجرات
۳۰ مارچ ۱۹۹۱ء

ڈیئر آفتاب۔ السّلام علیکم!

آپ کے موصولہ خطوط کا جواب دیر سے لکھ رہا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ دراصل وجہ یہ تھی کہ جب تک آپ کی ارسال کردہ کتب کا مطالعہ نہ کر لیا جاتا، آپ کے خطوط کا جواب دینا بے معنی سا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب کی چند کتابیں مثلاً معراجِ انسانیت، شاہکارِ رسالت، اقبال اور قرآن، تحریکِ احمدیت، تصوف کی حقیقت، اسبابِ زوالِ امت، مقامِ حدیث، مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں اور قرآنی فیصلے پڑھنے کے بعد اب آپ کے خطوط کا جواب دینا مناسب سمجھا۔ اور یقین کرو چند چھوٹی کتابیں تو میں نے ساری رات جاگ کر ایک ہی نشست میں مطالعہ کی ہیں۔ جس سے یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے تقریباً تمام غلط فہمیاں معدوم ہوتی چلی گئیں جو کہ موصوف کے متعلق ہمارے ذہن میں پیدا ہوئیں۔ یا ہمارے ذہنوں میں ڈال دی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں کتبِ مذکورہ بالا کے مطالعہ سے پرویز صاحب مرحوم و مغفور کے افکار و نظریات بھی بالوضاحت معلوم ہوئے کیونکہ جب تک کسی بھی محرک یا مفکر کے نقطہ ہائے نظر سے مکمل آگاہی نہ ہو اس کے مشن کے مفید یا مضر ہونے کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا حماقت متصور ہوتا ہے۔ اناں بعد ہم پرویز صاحب کی دعوتِ فکر کا اجمالی سا جائزہ لیں گے کہ موصوف نے اپنی تمام عمر جس مقصد کے لئے تحقیق و تصنیف پر صرف کر دی، انہیں اپنے اس مشن میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی اس محنت و کاوش سے انسانیت کی اصلاح و تعمیر مقصود تھی یا انتشار و تخریب۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ محترم پرویز صاحب نے اپنی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ زور اس امر پر صرف کیا ہے کہ وہ تمام اعمال اور اعتقادات جو اُمتِ مسلمہ میں رواج پذیر ہیں اُن کو پرکھنے کا معیار اور کسوٹی صرف اور صرف ضابطۂ خداوندی یعنی قرآنِ مجید ہے۔ لہٰذا جو عمل اور نظریہ قرآنِ کریم کی واضح تعلیمات کے مطابق ہو وہ بالکل درست اور جو اس کے خلاف ہو وہ یکسر غلط ہے۔ چاہے اس کی نسبت کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی طرف ہی کیوں نہ کی گئی ہو اور اپنے اسی نقطۂ نگاہ کی وجہ سے موصوف دورِ حاضر کے دیگر مفکرین و مصلحین سے ممتاز نظر آتے ہیں کیونکہ دعوے کے طور پر تو سب ہی مبلغین و محرکین دینِ اسلامی کا منبع و ماخذ قرآنِ کریم کو قرار دیتے چلے آتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ان رسوم و عقائد کو ترک کرنے کے لئے بھی تیار نہیں جو گذشتہ کئی صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے ان تک پہنچے ہیں۔ حالانکہ وہ قرآنِ پاک کے واضح احکامات کے خلاف اور روحِ اسلامی کے منافی ہیں۔ لہٰذا ان تمام عقائد و نظریات کو جو خلافِ قرآن ہیں لیکن مسلمانوں نے انہیں

عین اسلام سمجھ کر اپنایا ہوا ہے' کی مخالفت کی بنا پر مرحوم پرویز صاحب کو منکرِ حدیث اور منکرِ فقہ جیسے بے ہودہ الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بات ہر شخص کے لئے قابلِ تعجب ہے کہ کتاب زندہ کے اس عظیم مبلغ نے ہر قسم کی مخالفت اور الزامات فراخدلی و خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے تادمِ واپسیں اپنا مشن جاری رکھا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن بایں ہمہ موصوف نے کبھی بھی اپنی تحریر کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا۔ کیونکہ اندھی تقلید اور شخصیت پرستی کے اسی جذبے کی تو قرآن نفی کرتا ہے۔ ہر معاملے میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے والے شخص سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی پر اپنی رائے کو مسلط کرے بلکہ اس کے برعکس ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی دوسرے شخص نے قرآنِ مجید میں تدبر و تفکر کے بعد (پرویز صاحب کی رائے کے خلاف) صحیح راستہ اختیار کر لیا تو پرویز صاحب مرحوم نے بصد احترام اسے قبول کیا۔ آج اگر مسلمان قوم اس عظیم مفکر سے محروم ہے لیکن وہ اپنی تمام عمر کی محنت یعنی تحریر کردہ گراں مایہ تصانیف کے ذریعے امتِ مسلمہ کو ایسی شاہراہ پر گامزن کر گیا ہے جس پر چلنے سے یہ قوم اپنی متاعِ گم گشتہ دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور یاد رہے کہ پرویز مرحوم حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے بڑے مداح تھے' جس کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں میں ایک قدر مشترک تھی یعنی اقبال مرحوم اپنے شاعرانہ کلام کے ذریعے اور پرویز صاحب اپنی تحریر کے ذریعہ زندگی بھر یہی پیام ملتِ اسلامیہ کے افراد تک پہنچاتے رہے کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اور یہی وجہ ہے کہ شاعرِ مشرق کے کلام کو جس زاویۂ نگاہ سے پرویز صاحب نے سمجھا ہے اور جس پیرائے میں انہوں نے دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآنی بصیرت کا حامل ہو۔ خلافِ قرآن عقائد و نظریات رکھنے والا آدمی نہ ہی قرآنِ کریم کے مفاہیم و مطالب سے کماحقہٗ استفادہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کلامِ اقبال اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ تدبر فی القرآن اور تفکر فی الاسلام کی صلاحیت نہیں رکھتے' انہوں نے اقبال مرحوم اور پرویز مرحوم دونوں کی مخالفت کی اور ان کی دعوت پر غور کرنے کی بجائے مسلمان قوم میں ان دونوں مفکروں کے بارے میں منافرت پھیلانے کی کوشش کی۔

لیکن ان حضرات نے ہر قسم کی مخاصمت کو نظر انداز کرتے ہوئے تبلیغ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا اور جن جن حضرات تک ان کا لٹریچر پہنچا اس نے انہیں ایک نئی سوچ اور فکر عطا کی اور وہ ان کی تصانیف سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ علاوہ ازیں اگر کسی نے ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مخالفت کی تو وہ صرف ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنا پر تھی۔ جس کی وجہ سے حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ میں خوفِ طوالت

اسی سرسری سے جائزے پر اکتفا کرتا ہوں اور اپنی گذارشات کا سلسلہ اقبال مرحوم کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں، جو کہ پرویز صاحب کی تمام تقاریر، مقالات اور تحریروں کا ماحصل ہے۔ یعنی ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

پرویز صاحب کی کتب کے مطالعہ میں میرے ساتھ ہماری مسجد کے قاری حافظ جو درسِ نظامی کے تلمیذ بھی ہیں، شریک کار رہے اور ہم نے اپنے خیالات میں ہم آہنگی پائی۔ آخر میں سب گھر والوں کی طرف سے آپ کو، بھابی کو اور بچوں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا اور پیار قبول ہو، ایک دوسرے ورق پر آپ کی ارسال کردہ کتب کی تفصیل لکھ رہا ہوں اور ہماری لائبریری کی جو خدمت بآسانی ہو سکے اس کے لئے مشکور رہوں گا۔

والسلام آپ کا بھائی ۔ سید خالد محمود۔

HONOURABLE READERS !

PLEASE RENEW YOUR SUBSCRIPTION FOR THE ENSUING YEAR BEFORE DECEMBER 1992.

PLEASE DONATE LIBERALLY FOR THE GIFT SCHEME SO THAT SUPPLY OF MAGAZINE TO LIBRARIES IS NOT EFFECTED.

PLEASE CLEAR ALL OUTSTANDING DUES IN YOUR "PESHGHI KHATAS" BEFORE CLOSURE OF THIS YEAR.

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

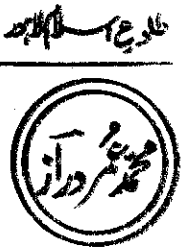

حالیہ سیلاب کی تباہ کاریاں اور ہم

(کیا یہ سیلاب فی الواقعہ عذابِ الٰہی تھا؟)

ستمبر ۱۹۹۲ء مہینے میں ہونے والی شدید بارشوں کے نتیجہ میں ملک میں ایک ایسا خوفناک سیلاب بلاخیز آیا جسے پاکستان کی تاریخ میں ہولناک ترین سیلاب کہا گیا ہے۔ یہ سیلاب اپنے راستے میں آنے والے انسانوں، جانوروں، بستیوں اور فصلوں کے نشانات تک مٹاتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ اپنی روانیوں کے دوران اس نے وطنِ عزیز کا شاید ہی کوئی گوشہ چھوڑا ہو جہاں اس نے نادیدنی تباہی نہ مچائی ہو۔ سیلاب کے دوران اور اس کے بعد وزیر اعظم صاحب کے طوفانی دوروں اور سیلاب سے متاثرین کی دلجوئی، ان کے نقصانات کے تخمینوں اور معاوضے کے طور پر حکومتی اشک شوئی کا سلسلہ جاری ہے۔

سیلاب گذر جانے کے بعد مختلف اداروں، تنظیموں اور اشخاص کی طرف سے ذرائع ابلاغ کے واسطہ سے تجزیے اور اسباب و علل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ حفاظتی تدابیر اور مستقبل کے لئے اس کے سدِباب کے نسخے جاری کرنے کے سلسلے تا حال جاری ہیں۔

اسباب و علل میں جہاں ایک طرف حکومتی اداروں کی طرف سے مجرمانہ غفلت کے الزامات لگائے جا رہے ہیں وہیں جناب وزیر اعظم اور علمائے کرام کی طرف سے اس سیلاب کو عذابِ الٰہی سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے۔ جب کہ دوسری طرف حکومت کی فرض شناسی اور جناب وزیر اعظم کی ان مسلسل کوششوں کی مدح سرائی بھی کی جا رہی ہے جو انہوں نے صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے انجام دی ہیں اور اب تک دے رہے ہیں۔

اس سیلاب کو عذابِ الٰہی قرار دینے والوں کا تعلق طبقہ جہلاء سے نہیں بلکہ ان کا شمار علمائے کرام میں ہوتا ہے لیکن ہمارے یہ بزعم خویش علمائے کرام ایسا کہتے وقت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فراموش کر دیتے ہیں کہ:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ.... (۴۲/۳۰)

"تمہیں جس مصیبت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے"

یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو جھٹلانے کی بات نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہیں جو مصیبتیں بھی پیش آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ہم پر یہ مصیبت اللہ کا بھیجا ہوا عذاب ہے۔ آفاقی حوادث مثلاً سیلاب، زلزلہ، آندھیاں، بارشیں اللہ کے طبعی قوانین کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جو قومیں ان قوانین کا علم حاصل کر کے ان سے حفاظت کا سامان پیدا کر لیتی ہیں وہ ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہتی ہیں جب کہ وہ قومیں جو اپنی تمام تر توانائیاں اپنی عیش پسندیوں کے سامان جمع کرنے پر ہی صرف کرتی رہتی ہیں وہ ان حوادث کے اسباب اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر سے غافل ہو جاتی ہیں اور یہ حوادث ان کے لئے تباہی اور بربادی لاتے ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کو جب زخمی کر دیا گیا تو آپ نے سب سے پہلے جو فقرہ ارشاد فرمایا تھا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا کہ

كَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۝ (۳۳/۳۸)

"اللہ کا امر اس کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے"

اور اس کی تشریح یوں کی گئی کہ حادثات سے اس وقت اموات ہوتی ہیں جب حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتی جائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے آفاقی حوادث اللہ کے طبعی قانون کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ انھیں روکنے پر شاید انسان کو ابھی بہت زیادہ اختیار نہ ہو۔ جیسے جیسے اس کا علم ان حوادث کو سمجھنے میں بڑھتا جائے گا، انسان ان کے سدباب کے لئے زیادہ بااختیار ہوتا جائے گا۔ مثلاً زلزلوں کی تباہ کاریوں کو کم کرنے کے لئے (SEISMOLOGY) کی سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور زلزلے کی شدت کو کم کرنے اور اس کے نقصانات سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا، انسان کا دائرۂ عمل ان حوادث کے نقصانات سے بچنے کی تدابیر تک محدود ہے۔ ہمارے ہاں (FLOOD WARNING SYSTEM) کا ادارہ ہے جو بروقت متوقع شدید بارشوں اور سیلاب کی آمد کی خبر دیتا ہے۔ اس ادارہ کی (WARNING) سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا، حکومت کے دوسرے متعلقہ اداروں کا کام ہے۔ مثلاً یہ مسلسل اور متواتر کہا جا رہا ہے کہ اگر منگلا ڈیم سے پانی کا اخراج کچھ دیر پہلے شروع کر دیا جاتا (جو اس لئے نہ کیا گیا کہ کچھ پسندیدہ لوگوں کے ٹرک (SPILL WAY) سے ریت نکال رہے تھے) تو سیلاب کی تباہ کاریوں میں اتنی شدت اور ہمہ گیری پیدا نہ ہو پاتی۔

حالیہ سیلاب سے پہلے صوبہ پنجاب نے بالخصوص ۱۹۸۸ء میں بھی سیلاب کی ہولناکیوں کے ہاتھوں شدید

نقصان اٹھائے تھے۔ ۱۹۸۸ء کے سیلاب کے بعد ہم نے سیلاب کی تباہ کاریوں کے خلاف حفاظتی تدابیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۸۸ء کے استقبالیہ میں یہ کہا تھا کہ :-

"صوبہ پنجاب میں برپا ہونے والی قیامتِ صغریٰ، فطرت کی قوتوں کی بلاخیزی کا نتیجہ ہے۔ اس سے ہونے والے نقصانات بھی ہماری، اپنے حفاظتی انتظامات واقدامات سے غفلت کا فطری نتیجہ ہے..... تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ :-

قومِ سبا کے لوگ بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لئے انھوں نے بڑے بڑے بند بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسلطنت مآرب کے قریب تھا جسے سدِ مآرب یا عرم مآرب کہا جاتا تھا۔ یہ بند پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین ایک وسیع وعریض باغ بن گئی تھی۔ قرآن نے ان کی اس خوشحالی کا تذکرہ سورۂ سبا کی آیہ ۱۵ میں خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ لیکن دولت وحکومت اور خوشحالی کے نشہ نے ان میں بدترین قسم کی بدمستیاں پیدا کر دیں۔ ان کے دارالسلطنت کا بند شکستہ حالت ہوتا رہا اور یہ قوم اپنی بدمستیوں میں مصروف اس کی ضروری مرمت سے یکسر غافل رہی۔ حتیٰ کہ اولاً اس بند کی دیوار میں درزیں اور دراڑ پڑے اور بعد میں شگاف۔ یہ بند ٹوٹا اور اس سے سارا شہر تباہ وبرباد ہوگیا اور گردو پیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا — قرآنِ کریم نے ان کی اس عبرتناک تباہی کا ذکر سورہ سبا کی آیات ۱۶ اور ۱۷ میں کیا ہے۔

یہی حال کچھ ہمارا بھی ہوا ہے۔ ہمارا حکمران طبقہ ہمیشہ اپنی کرسیاں بچانے اور حریفوں کو زیردست رکھنے کی محلاتی سازشیں کرنے میں اتنا مصروف رہا کہ انہیں اپنے دریاؤں اور نہروں کا کچھ خیال نہ رہا۔ برسہا برس کی روانیٔ آب سے ان کی تہیں کیچڑ اور دور دراز کے پانی کے میل کچیل سے اٹتی رہیں۔ لیکن کسی کو نہ سوچنے کی فرصت ملی کہ ان کی تہوں کو اتنا گہرا رکھنا ضروری ہے کہ یہ بارشوں کے موسم میں کثرت سے آنے والے پانی کو اپنے ساحلوں کے اندر پابند رکھ سکیں، CONTAIN کر سکیں۔ اور نہ ہی کسی نے ان کے کناروں کو بلند اور مضبوط رکھنے پر توجہ دی۔ زیادہ دُور کیوں جائیے۔ یہیں پڑوس ہی میں گلبرگ اور شاہ جمال کے درمیان بہنے والی نہر کو دیکھیے جو آجکل سوکھی پڑی ہے اور خود معلوم کر لیجئے کہ اس کی تہہ میں جمع شدہ کیچڑ اور مٹی کس طرح اس کے دونوں کناروں سے ہم آغوشی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگر یہ نہر اپنی پوری لمبائی

کے دوران اپنی موجودہ زیریں سطح سے ایک فٹ بھی گہری ہو تو تصور میں لائیے کہ یہ پانی کا کتنا بڑا ریلا اپنے ساحلوں میں سنبھال سکتی ہے۔ یہی حال راوی اور دوسرے دریاؤں کا ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے کہ جب تک بہتا ہوا پانی ساحلوں کے اندر رہتا ہے، یہ انسان کے لئے بے انتہا کارآمد رہتا ہے اور انسانی زندگی کا سہارا بنتا ہے۔ لیکن جونہی یہ ان ساحلوں کی حد بندیوں سے باہر نکلتا ہے تو انسان اور اس کی جملہ متاعِ زیست کی ہلاکت و بربادی کا سیلابِ بلاخیز بن جاتا ہے۔ مغربی ممالک اپنے دریاؤں اور نہروں کی تہوں (BEDS) کو مستقلاً کھودتے، EXCAVATE کرتے رہتے ہیں اور یوں ان میں بہنے والا پانی ہمیشہ اپنے ساحلوں کے اندر رواں دواں رہتے ہوئے ان کے لئے زیست آفریں بنا رہتا ہے۔ وہ اپنے ان منصوبوں (PROJECTS) پر لاکھوں کروڑوں روپے سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن یہ خرچ اس نقصان کے سامنے پرِ کاہ جتنی قیمت بھی نہیں رکھتا جو اس سیلابِ بے پناہ سے ہوتا ہے۔ جب یہی پانی ساحل ناآشنا ہو جاتے۔ ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والے ارباب نے کبھی خود کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنایا بلکہ جب عامۃ الناس اپنی ضرورتوں کے تحت دریاؤں اور نہروں کی تہوں سے ریت اور مٹی نکالنا چاہتے ہیں تو انہیں بھاری رقوم ادا کرنا پڑتی ہیں اور بعض اوقات عقوبت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ کاش انہیں کوئی اتنا سمجھا دے کہ اگر یہ عوام کو ہی کھلی چھٹی دے دیں کہ جاؤ اپنی ضرورتوں کے مطابق دریاؤں اور نہروں سے ریت اور مٹی لے لو تو یہ لوگ حکومت کی عدم توجہی کے شکار اس مسئلہ کو کتنی آسانی سے حل کر دیں اور یہی دریا اور نہریں پانی کی طغیانیوں کو کامیابی کے ساتھ اپنے ساحلوں کے اندر سمو سکیں۔ ہے کوئی جو سیلاب سے تباہ ہونے والے انسانوں کی بحالی اور آبادکاری کے لئے اربوں روپیہ خرچ کرنے والے ان اربابِ اقتدار کو یہ سادہ سی بات سمجھا سکے؟ یاد رکھئے! جب جرائم قومی شکل اختیار کر جائیں تو ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تباہی بھی پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

(ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۸۹ء)

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جہاں ہر قسم کے تجزیے اور حل پیش کئے جا رہے ہیں وہاں اس طرف کسی ماہر کی نگاہ نہیں گئی۔ ہمارے ہاں (کم از کم) قیامِ پاکستان کے بعد سے اس طرف قطعاً توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجۃً ہمارے دریاؤں کے دامن اور ان کی تہیں (BEDS) اس طرح "بھل" سے لبریز ہوتے آ رہے ہیں کہ دریاؤں کی مسافت کے دوران کئی ایک گہرے

یہ معلوم ہی نہیں پڑتا کہ یہاں دریا بہہ رہا ہے۔ ان کی BEDS تقریباً کناروں کی اونچائی تک آچکی ہیں۔ ان حالات میں یہ دریا سیلاب کے ریلوں کو کس طرح ساحلوں کے اندر رکھ سکتے ہیں۔ وہ ساحلوں سے اُمنڈتے ہیں اور انسانی بستیوں کو ان کے ساکنین اور مال و متاع سمیت اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ کئی ایک مقامات پر ہوائی جہاز سے معائنہ (AERIAL SURVEY) کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے دریا، شہروں سے بلند ہیں اور شہر دریاؤں کے مقابلہ میں زیرِ سطح ہیں۔ تصور میں لائیے کہ اگر ہمارے دریاؤں کی تہیں علی الطول ۵/۴ فٹ بھی گہری ہوں تو پانی کی کس قدر مہیب مقدار ساحلوں کے اندر بہہ سکتی ہے۔

ہم حکومت کی توجہ اس امر کی طرف دلا کر انہیں دعوت دیتے ہیں کہ اس کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی بنا کر ان کے سپرد یہ ذمہ داری کی جائے کہ وہ ایسا منصوبہ بنائیں کہ مسلسل اور متواتر خشک موسموں میں اس پر کام ہو اور دریاؤں کی تہوں کو گہرا کرنے کا کام مستقل بنیادوں پر انجام دے کر قوم کو اس کی تباہ کاریوں سے بچانے کا انتظام کرے۔ اس منصوبہ پر اُٹھنے والے اخراجات اس بے اندازہ نقصان کے سامنے ہیچ ہوں گے جو متاثرین سیلاب کی از سرِ نو آبادکاری پر خرچ کی مد میں اٹھایا جاتا ہے۔ کیا برسرِ اقتدار اصحاب میں کوئی ایک رجلِ رشید بھی ہے جو اللہ کی اس انذار (WARNING) پر توجہ دے سکے کہ

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ.

(۵۷/۲۲)

خارجی دنیا اور انسانی زندگی میں آنے والی ہر مصیبت اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے۔

یاد رکھئے

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں قوموں کے گناہوں کو معاف

PLEASE REVIEW THE LIST OF SUBSCRIBERS WHOSE SUBSCRIPTION IS CHARGED TO YOUR BAZM/KHATA AND UPDATE THE LIST BEFORE DECEMBER 92.

ثمینہ ظہور

اقبالؒ کا پیغام نئی نسل کے نام

شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں جب خرد و ہوش کو اکثر خطاب کیا ہے۔ بے شک وہ بہت بڑے شاعر، بہت بڑے فلسفی اور عملی سیاستدان تھے۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ بہت بڑے عملی انسان تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ دوسرے لوگوں کے سامنے بھی عملی طور پر پیش کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو دوبارہ بامِ عروج کی طرف بلایا اور اس تک پہنچنے کے لئے لائحہ حیات پیش کرنے کے علاوہ عمل کا ہتھیار بھی دیا۔ ان کے نظریے کے مطابق کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں عمل کی طاقت نہ ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔

"قومیں عمل کے بغیر تباہ ہو جاتی ہیں۔"

جس وقت اقبالؒ نے شاعری کی ابتدا کی مسلمانوں پر ایک خوابِ گراں کا عالم طاری تھا، وہ مجبور و بے بس غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے، ان پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں لیکن اقبالؒ نے اپنے کلام سے ان کی سرد رگوں میں خون دوڑایا، انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو گئے۔ حکومتیں ہاتھوں میں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن کوئی قوم بھی بطور قوم فنا نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں ان تمام اسلاف کا حال بیان کیا ہے جو بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے سے گریز نہ کرتے تھے اور جنہوں نے کبھی یورپ کے کلیساؤں اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دے کر پیغامِ حق کا چرچا کیا اور یوں لوگوں کے دلوں میں نئے ولولے پیدا کئے۔

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اقبالؒ کو جہاں دوسرے مسلمانوں سے محبت تھی وہیں کشمیر کے عوام کی حالتِ زار پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

کشمیر میں انہوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب اسلام کی خاطر جدوجہدِ آزادی کرتے دیکھا تو انہیں اپنی نظموں کا عنوان بنائے بغیر نہ رہ سکے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

اقبالؒ کا مردِ مومن قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کا مکمل پیکر ہے جو حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں فولاد ہے۔ جس کی نظروں میں کہکشاں و حمام نہیں بچتے بلکہ وہ جبریل و اسرافیل کا صیاد ہو جاتا ہے۔ جس کی اُمیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہیں، ادائیں دل فریب اور نگہ دل نواز ہے جو بیک وقت جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اور دریاؤں کے دل بھی دہلاتا ہے۔ وہ لا کے ساتھ الا کا بھی قائل ہے۔ اقبالؒ مسلمانوں کو نہ تو غلامانہ زندگی گذارنے کی تلقین کرتے ہیں اور نہ بزدلانہ اندازِ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان جب میدانِ کارزار میں ہو تو وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑتا ہے اور جب دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہو تو بلبل خوش نوا کی طرح چہکتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مردِ مومن کا نصب العین یہ ہے کہ اس کی ذات جلالی و جمالی صفات کی موزوں ترکیب ہو اور وہ سوز و سازِ زندگی کا رمز شناس ہو، اس کے تنِ محکم میں دردآشنا دل ہو جیسے کوہسار کے پہلو میں جوئے خوش خرام۔ اقبالؒ زندگی کی تشکیل کے لئے کچھ قدروں کی حفاظت ضروری سمجھتے ہیں اور کچھ عناصر کو خونِ دل میں حل کرنا پڑتا ہے۔ ان میں وحدت، رسالت، اخوت، مساوات، حیا اور جہاد شامل ہیں۔ عشق، شجاعت، رواداری، کسبِ حلال، مقاصد آفرینی، یقین، آرزو، جستجو، کشمکش، انقلاب، فقیری اور قلندری ایسے عناصر ہیں جو مسلمانوں کے خمیر میں شامل ہیں۔ وہ سہولت، تن آسانی، سستی، کاہلی، سہل انگاری اور جمود کی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی نام ہے مر مر کے جینے کا۔ اقبالؒ ساحل پر کھڑے ہو کر موجوں کا تماشا کرنے کے قائل نہیں بلکہ وہ موجوں سے لپٹ کر طوفانوں سے اُلجھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوامِ زندگی

جسٹس ایس اے رحمان، جو اقبالؒ کے قریبی دوستوں میں سے تھے، کہتے ہیں۔

"ان کی وسعتِ نظر اور ان کا مسحور کن اندازِ بیان ہمارے لئے بصیرت افروز تھا۔"

اقبالؒ کے فن نے ہمارے تصورِ حیات کو نہ صرف وسعت و عروج بخشا بلکہ ہمیں ہماری پوشیدہ صلاحیتوں سے بھی آگاہ کیا۔ انہیں خدا سے شکوہ ہے کہ اس نے اپنے لئے تو لامکاں پسند فرمایا اور انسان کو چار سو کی قید میں بند کر دیا اور اس پر خوش ہے کہ میں نے انسان کو بے انتہا دولت سے نواز دیا۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو

وہ کہتے ہیں کہ اگر آدمِ خاکی کو زوال نصیب ہوا، تو یہ میرا زوال نہ ہوگا بلکہ تیرا ہوگا۔ اس لئے کہ انسان کی ذات سے عالم کی ہماہمی اور کوکبؔ کی تابانی سے تیرے جہاں کی روشنی ہے۔

اس کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

کسی شاعر نے ایک قوم کے ذہن پر اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا اقبالؒ نے مسلمانوں کے ذہنوں پر ڈالا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے پوری انسانیت کو راہِ عمل دکھانے کی کوشش کی۔ ان کی زندگی ایک کربِ ناتمام اور سوزِ مسلسل تھی۔ وہ ساری عمر مسلمانوں اور انسانوں کی فلاح و بہبود، سربلندی اور ترقی کے لئے سوچتے رہے، تڑپتے رہے۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

اقبالؒ فرد کو قطرہ اور وطن کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلم قوم وسیع اور بے کراں ہے اور جغرافیائی حدود اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں وہ رنگ و نسل کی بنیاد پر وطنی تصور کے خلاف ہیں لیکن حب الوطنی کے مخالف نہیں۔ وہ اسے امتِ مسلمہ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں جب کہ وطنیت کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

اقبالؒ کی سیاسیات کا دامن ایک طرف ضبط و قانون اور دوسری طرف اخلاق سے منسلک ہے۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست میں ایک پائیدار رشتہ پایا جاتا ہے۔ وہ ان دونوں کو الگ کرنے اور عناد کو ہوا دینے کا الزام میکاولی اور مارٹن لوتھر کو دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین کا آخری مقصد کچھ 'دیکھنا' نہیں ہے بلکہ کچھ 'ہونا' ہے جس کے لئے سعیٔ پیہم کی ضرورت ہے۔ عمومیت اور جمہوریت امن و عدل کی امین نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ اس کی بنیاد دین پر نہ ہو۔

تہذیبِ جدید کے بعض علمبرداروں کی آنکھوں میں اگر علامہ کھٹکتے ہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے مغربی تعلیم و تمدن اور جدید فلسفہ و سائنس کے سمندر میں غوطہ لگا کر بھی ایک طرف اپنا ایمان اور ضمیر محفوظ رکھا، دوسری طرف جدید فلسفہ اور مادہ پرستانہ تعلیم و تہذیب کو ناواقفینِ حال کے سامنے اچھی طرح کھول کر بیان کیا اور مسلمانوں کو ڈنکے کی چوٹ آگاہ کیا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اس مقصد کے لئے انہوں نے کبھی گذشتہ عظمت کے نقشے پیش کئے اور کبھی اشاروں کے ذریعے اپنے قافلے کے ہمراہانِ سست عناصر کو تیز گامی کی طرف متوجہ کیا، ان کی کور ذوقی، تنگ نظری، کم نگاہی، جہالت، تعصب اور بے یقینی کی نشاندہی کر کے ان کے اصل مقام سے آگاہ کیا اور اس کے لئے نظریۂ خودی پیش کیا۔ خودی کا مطلب ہے خودشناسی سے ذاتی صلاحیتوں سے آگاہی اور پھر زیست کے میدان میں سیرتِ فولاد پیدا کرنا۔ وہ کہتے ہیں

"خودی ہمیں نظر نہیں آتی بلکہ اس کا جلوہ دوسری چیزوں میں نظر آتا ہے۔"

پھر کہا۔

"خودی ایک ایسا جذبہ ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتا ہے۔"

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

خودی ایک بحرِ بیکراں ہے۔ یہ ایک روحانی شے ہے۔ انسان کی خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوتی ہے۔ اس کی تربیت کے لئے اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی ضروری ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آرزو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی نہ روسیاہی

اقبالؒ خواتین کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرد و عورت کا دائرۂ کار مختلف ہے۔ وہ اس مغربی نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ مرد و زن میں مکمل مساوات ہونی چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے ..... وہاں ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی گئی ہے۔ جہاں عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے اُلٹا نقصان دہ ثابت ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی' خاندانی وحدت کے رشتے جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔"

عورت کو اگر جہادِ زندگی میں مرد کے برابر لا کر کھڑا کر دیا جائے' تو وہ اپنی نسوانیت کھو دے گی۔

مکالماتِ افلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

عورت کا شرف و امتیاز اس کے ماں ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ آزادیٔ نسواں کی تحریک کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے' اس سے ان کی مشکلات کم نہیں اور پیچیدہ ہو جائیں گی۔ ماں کی شفقت کو وہ پیغمبر کی شفقت کے قریب کہتے ہیں۔

تہذیبِ فرنگی سے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت

کرمفرماؤں سے ضروری التماس

مجلہ طلوعِ اسلام کا زرِ شرکت۔ گفٹ سکیم میں معاونت اور نشر و اشاعت کے لئے عطیات

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵۔ بی گلبرگ II۔ لاہور۔ پاکستان۔

کے نام ارسال فرمائیں تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دقت نہ ہو۔

ناظم ادارہ

حقائق و عبر

فرقہ وارانہ جنون ۔ خود اہلِ مذہب کی نظر میں

"لسانی، علاقائی اور صوبائی تعصبات کیا کم تھے کہ وطنِ عزیز فرقہ وارانہ چپقلش اور تصادم کی لپیٹ میں ہے۔ گلگت ہو یا جھنگ، کبھی کراچی ہے تو کبھی پشاور، بڑا شہر ہے یا قصبہ، یہ آگ ہر جا پہنچ چکی ہے۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کروڑوں کی جائیداد نذرِ آتش ہے۔ کاروباری حلقے پریشان ہیں کہ انہیں نہ وہ ماحول اور تحفظ حاصل ہے جو کاروبار کا لازمی خاصہ ہے۔

کلمہ گو ایسے تقسیم ہوئے کہ مسجدیں الگ الگ۔ اب تو تعمیراتی انداز بھی جدا ہونے لگے ہیں۔ ایک ہی فقہی سکول سے متعلق حضرات میں بُعدِ فکر اس قدر پیدا ہو چکا ہے کہ فروعی مسائل نے خود ایک فقہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دیگر مسالک و مذاہب سے قربِ اتصال کا تو خیال بھی ایک دیوانے کا خواب ہے۔ تحریر، تقریر زہر آلود، اندازِ تخاطب ایسا گھٹیا کہ انسان سوچتا ہے کہ کس دین کے مبلغ ہیں اور کیسے واعظ ہیں۔ ایک دوسرے کے اکابر و اسلاف کی تضحیک کرنا گویا اپنے مسلک و مذہب کی حقانیت کی دلیل ہے۔ یہ فرقہ وارانہ جنون اب اس قدر بڑھا کہ ایک دوسرے کو غیر ملکی ایجنٹ تک کہا جانے لگا۔ غیر ملکی امداد خواہ نقدی کی صورت میں ہو یا آتشیں اسلحہ ہو۔ ان کی باتیں ہونے لگی ہیں نفاذِ شریعت کیسے اور نظامِ مصطفیٰؐ کیا آئے گا غیر ملکی مداخلت کار نے آکر وطنِ عزیز کے استحکام، ترقی اور داخلی امن و امان کو تہس نہس کر دیا ہے۔ جو دین نظم و ضبط اور قانون ضابطے کا پابند کرتا ہے۔ اس کے چاہنے والے اب لاقانونیت اور ایک حد تک دہشت گرد کی شکل میں نظر

آتے ہیں. آج مسلمان سوچتا ہے کہ یہ کیا انداز ہے اور کیسا طریقہ ؟ محراب و منبر کی کیا ذمہ داریاں تھیں اور کیا کیا تقاضے تھے ؟ جو آج عنقا ہیں اہلِ علم اور اہلِ فن کے قحط الرجال نے امتِ مسلمہ کو کس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ اب تو ماشاء اللہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ عزت، شہرت، دولت، دھونس اور "ترقی" کے لئے ایم پی اے، ایم این اے ہونا لازمی پایا ہے۔ کیا علماء اور کیا مشائخ ہر ایک روائیتی سیاست کا شہسوار نظر آتا ہے خانقاہ و مسجد میں کم مگر حکومتی دربار میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ حضرات علماء مشائخ گستاخی معاف فرمائیں تو کیا قوم کو بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے کتنے افراد پیدا کئے جو علم و فن میں اسلام اور مسلمانوں کا سر اونچا کر سکتے ہیں۔ کیا ہمارے گھروں اور ہمارے مدارس و مساجد میں اسلام کا نور بھی نظر آتا ہے ؟ کردار و عمل کا جو نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں وہ خدا لگتی فرمائیے کیا اسلام ہے ؟

ہمارے اس کردار و عمل نے پہلے باشعور حلقے کو پریشان کیا اب نوجوان نسل متنفر ہو رہی ہے۔ پہلے کفر سازی کی اور اب کلاشنکوف کلچر سے مزین ہو کر کسی سے پیچھے نہیں۔ اس صدی میں یہ طریقہ اصلاحِ امت کے لئے شاید مفید ثابت ہو۔ دیوبندی، بریلوی، مقلّد غیر مقلّد اور شیعہ سُنّی اختلافات اب عقل و خرد کی آخری حدوں کو پار کر چکے ہیں۔ شیعہ سنّی تنازعہ پہلے ہی سنگین تھا اب حالیہ محرّم میں واقعۂ پشاور نے ہر پاکستانی کو غمزدہ کر دیا ہے ملک میں پہلے ہی قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ لوٹ مار، ڈاکہ زنی عام ہے کہ کسی کی جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں۔ اجتماعی آبروریزی کے واقعات نے ہمارے قومی، ملی تشخص کو مجروح کر دیا ہے۔ معاشی اور معاشرتی حالات دگرگوں ہیں۔ اب رہی سہی کسر فرقہ وارانہ فسادات نے پوری کر دی ہے۔ اختلافِ فکر بجا مگر اسلامی رواداری اور تحمل و برداشت بھی کچھ چیز ہے جس کی ہدایت و رہنمائی ہمیں ہمارا دین دیتا ہے۔ اگر پہلے حضرات نے دانستہ کوئی ایسی بات لکھ دی تھی جو دینی لحاظ سے قابلِ گرفت ہے تو کیا ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے ؟ ان کا معاملہ اب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ہم اس سے برات کر دیں اور اپنے اخلاف و اولاد کو اس زہر سے بچالیں۔ انہیں یہ خطرناک مواد نہ دیں تاکہ آئندہ آگ و خون کا کھیل نہ کھیلا جائے۔ عبادات کی بھی یہی صورت ہے۔ اسلام نے عبادات کا واضح تصور دیا ہے۔ ہم نے اپنی مذہبی روایات کے تحت کچھ عبادات بنا ہی لی ہیں تو ان کو بھی کسی طریقہ سلیقہ کا

پابند کیا جا سکتا ہے۔ انسان اگر اچھائی اپنانا چاہے تو طریقے آسان ہیں۔ نیت میں خرابی ہو تو بہانے ہزار، کیا مذہبی جلوس نمازِ حج سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں وقت جگہ کے پابند ہو سکتے۔ جب کبھی خرابی ہوئی تو ایسی عبادت (مذہبی جلوس) پر ہوئی جو بیرون مسجد عبادت گاہ تھی۔ اب بھی یہی ہو رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری حکومتوں کی "وقت ٹپاؤ" پالیسی نے فرقہ وارانہ تصادم کرائے ہیں۔ یہ بے وقت اور کسی قاعدہ قانون سے مبرا مذہبی جلوس خرابی پیدا کرتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ کہ ان کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اگر یہ عبادت خانوں تک محدود نہیں ہو سکتے تو کم از کم ان کی تعداد، اوقات، راستوں کو ضرور محدود کیا جا سکتا ہے۔ مسلم دنیا میں بھی آخر مذہبی جلوس نکلتے ہیں؟ ان کو دیکھا جائے تمام مسالک و مذاہب پر مشتمل ایک نمائندہ وفد مسلم دنیا کا دورہ کرے اور پھر ایک مناسب فیصلہ کیا جائے۔ دریں اثنا حکومت اپنے کارندوں اور افسر شاہی کو سختی سے ہدایات دے کہ وہ مزید جلوسوں کو روکے۔ ایک نام ہے "روایتی جلوس" یہ وہ مذہبی جلوس ہیں جو جب چاہا جہاں سے چاہا برآمد کر لیا اور آئندہ سال اسی کو جواز بنا کے اڑ گئے۔ ظاہر ہے نتیجہ خون خرابہ ہوگا۔

مگر ہماری سرکاری مشینری صاف بچ جائے گی جو اس جلوس کی برآمدگی کی ذمہ دار تھی اور اس کی غفلت اور کوتاہی سے معاملہ بگڑا۔ دوسری توجہ طلب بات لاؤڈ سپیکر کا استعمال ہے۔ دیگر آرڈی نینسوں کی طرح اس کا بھی بُرا حشر ہے۔ دنیا بھر میں لاؤڈ سپیکر استعمال ہوتے ہیں مگر ہمارا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ایک ہی شہر میں ایک وقت جو اذانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ختم ہونے کو نہیں آتا۔ خدا معلوم اوقاتِ اذان میں بھی ہم یکسانیت کیوں پیدا نہیں کر سکے۔ مسجد چھوٹی سی ہے، سامعین محدود مگر لاؤڈ سپیکر سارے علاقہ کو ہیجانی کیفیت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ یہی لاؤڈ سپیکر غیر ذمہ دارانہ باتوں سے اشتعال پیدا کرتا ہے۔ حکومت جہاں اور معاملات میں غفلت سے کام لے رہی ہے وہاں پر اس قانون سے بھی لاتعلق ہے۔ سندھ آپریشن کر کے حکومت کا یقیناً حوصلہ بڑھا ہوگا۔ وہ اس بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدہ صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کرے۔ قابلِ اعتراض کتب و رسائل پر پابندی لگائے، مذہبی جلوسوں اور جلسوں کو کسی قاعدہ ضابطے کا پابند کرے۔ ایسے افراد جماعتوں پر نظر رکھے جو فرقہ وارانہ خرابی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوں۔ معاشرہ

میں اور بہت سی خرابیاں موجود ہیں۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ، منشیات فروشی، اغوار، چوری، رہزنی جیسے جرائم نے ہر شہری کو پریشان کیا ہوا ہے۔ عدل اور مساوات کے لئے لوگ ترستے ہیں۔ میرٹ کی باتیں ہیں مگر میرٹ ایم پی اے/ایم این اے کو حاصل ہے۔ ان ساری خرابیوں کو کون دور کرے گا۔ حکومت ہی ایک ایسا ادارہ ہے جسے یہ قوت حاصل ہے۔ حکومت کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہئیں اور ملک کو مزید کسی سیاسی، معاشرتی نقصان سے بچانا چاہیئے۔ آج کا فرقہ وارانہ جنون بھی سیاسی ابتری اور عدم مساوات کی طرح حکومت کا تحفہ ہے۔ وطنِ عزیز کا استحکام اور اس کی ترقی کے لئے عوام اب بھی تیار ہیں۔ اخلاص اور عمل کی ضرورت ہے۔ حکومت اپنے عوام کو اعتماد میں لے اور کچھ کرے۔ انشاء اللہ عوام اس کا پورا ساتھ دیں گے۔ شرط یہ ہوگی کہ حکومت قانون اور لاء سے مخلص ہو نہ کہ وہ اپنے حواریوں اور جیالوں سے پیمانِ محبت باندھتی رہے معاشرہ کا بگاڑ، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، جس نوعیت کا ہو حکومت کے اخلاص و عمل سے ختم ہو سکتا ہے۔ اس طرف حکومت کو پیش رفت کرنی چاہیئے۔ دردمند اہلِ علم اور اہلِ قلم بھی آگے بڑھیں اور قوم کی رہنمائی کریں۔

(ماہنامہ "شمس الاسلام بھیرہ اگست ستمبر ۱۹۹۲ء) ص ۳-۱

طلوعِ اسلام

بقول حمایت علی شاعر

میں کس کے نام لکھوں یہ ستم، کہ اہلِ کرم
فقیہہ و صوفی و مُلّا ہیں، برہمن بھی نہیں

پھر وہی گورنر ــــ اور ــــ وہی لوٹا

۲۱۔ ستمبر کے روزنامہ جنگ میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک اخبار نویس نے گورنر پنجاب میاں اظہر سے کہا کہ جامعہ اشرفیہ والوں نے آپ کو کسی تقریب میں مدعو کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے انہیں "لوٹے" والی گفتگو یاد کرائی تھی مگر وہ پھر بھی بلا رہے ہیں۔ جامعہ اشرفیہ تو خود "اشرفیوں" کا گھر ہے اور مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب وہاں کے "سب کچھ" ہیں۔ انہیں "اشرفیوں" کے مقابلے میں کس "ڈالر" کی ضرورت ہے؟ ــــ خدارا یہ سلسلہ بند کیجئے ــــ اقربِ سلطانی کی خواہش آپ کے مقام سے بہت فروتر ہے ــــ آخر آپ اس جی حضوری سے کیوں باز نہیں آتے ــــ ننگِ اسلاف کو رسوا نہ کیجئے ــــ اور علمائے حق کے مقام کی حفاظت کیجئے جو آپ کی اخلاقی اور دینی ذمہ داری ہے ــــ سجادہ و عمامہ کو تاج و نگین کے سائے سے محفوظ رکھیے ــــ حفظکم اللہ

توہینِ مُلّا

جماعت اہلحدیث کا خصوصی ترجمان ہفت روزہ "تنظیم اہلحدیث" اپنی ۲۵ ستمبر ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے:

ناعاقبت اندیش رہنماؤ! تمہارے یہ بیانات اور سرکشی ہی قوم کی تباہی کا سبب بن گئی

اب اسی طرح اخبارات ہی کے ذریعے اپنے رب سے گڑگڑا کر معافی مانگو تاکہ رب تعالیٰ پیش آمد قحط سے تو قوم کو بچالیں۔

پاکستان کے نام نہاد مسلم رہنماؤ اور حکمرانو!

کچھ دیکھا تم نے! کہ

خود کو مسلمان کہلا کر قرآن و سنت اور علمبرداران قرآن و سنت کے خلاف تمہارے مسلسل تمسخر اور تضحیک آمیز بیانات کے بعد

اللہ کی کیسی گرفت آئی؟ کہ

بستیاں اُجڑ گئیں ــ فصلیں برباد ہو گئیں ــ لہلہاتے کھیت آن واحد میں ملیامیٹ ہو گئے ــ زمینیں ناقابل کاشت ہو گئیں ــ دیکھتے ہی دیکھتے عمر بھر کی پونجیاں پانی میں بہہ گئیں ــ ہزاروں بچے یتیم اور مائیں بیوہ ہو گئیں ــ

ــ اور اَب پوری قوم کیلیے قحط منہ کھولے کھڑا ہے

لیکن اس سب کچھ کے باوجود ــــ

کچھ سنا تم نے! کہ

بپھرے ہوئے دریاؤں کی بے ہنگم طغیانیوں سے ایک آواز مسلسل آرہی ہے

کہ تم اب بھی خداے قدوس کی سرکشی، نافرمانی اور شعائر اسلام کے خلاف دریدہ دہنی سے باز آجاؤ ــ علمبرداران قرآن و سنت کے خلاف بے جا نفرت نہ پھیلاؤ ــ زن، اسلام و مسلمین سے بغاوت نہ کرو ــ بلکہ دنیا کی تمام طاقتوں سے باغی ہو کر صرف اسی کے وفادار ہو جاؤ۔ اُس بادشاہ ارض و سما کے ــ اپنے حضور گڑگڑا کر رحمت و مغفرت طلب کرو جس کے بعد زمین و آسمان کی کوئی ہستی بھی تمہیں تباہ نہیں کر سکتی!

ہے کوئی جو دریاؤں کی طغیانی کی اس آواز پر کان دھرے! کہ

قدسیان عرش بریں اپنے نورانی پروں کو پھیلائے ہوئے رحم و معافی کے طلبگاروں کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ تم پر اب بھی رحم کر دیا جائے!

- انسانوں کے ہاتھ کان کاٹنا مناسب نہیں سمجھتے ــ بینظیر بھٹو
- میں شیعہ ہوں، میری زکوٰۃ نہ کاٹی جائے ــ بیگم نصرت بھٹو
- "شیعہ مسلمان ہیں، انہیں کافر کہنا جائز نہیں" ــ وزیراعظم نواز شریف، ۱۸ اگست ۱۹۹۲ء
- مولوی بنانے سے بہتر ہے کہ بچوں کو جیل بھیج دیا جائے ــ گورنر پنجاب
- مولوی کی بنیاد پرستی کی وجہ سے پاکستان ترقی نہیں کر سکتا ــ سردار آصف، وزیر اقتصادی امور
- مولوی کی حکومت آگئی تو کوئی مسلمان نہیں رہیگا ــ وفاقی وزیر غلام احمد بلور، ۶ ستمبر ۱۹۹۲ء
- مُلّا ازم نہیں، شہنشاہ کے بارے میں میرا ہی موقف چلے گا ــ سردار آصف احمد علی
- مولویوں نے اسلام اور پاکستان کو بدنام کر دیا ہے ــ وزیر مملکت انور عزیز
- مولویوں نے نماز کو بڑی نیکی سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ کوئی بڑا عمل نہیں ــ وفاقی وزیر غلام احمد بلور، ستمبر ۱۹۹۲ء
- مولویوں کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کار ملک میں صنعت لگانے کو تیار نہیں
- مُلّا ازم کو جنرل ضیاء الحق نے فروغ دیا
- توہین رسالت بل کا مقصد ملک کو مُلّائیت کی طرف لیجانا ہے ــ بینظیر بھٹو
- ترکی جیسا اسلام ہونا چاہیے جہاں عورتیں سکرٹ پہنتی ہیں اور ملک بھی ترقی کر رہا ہے ــ ... نسیم ہگل

مگر حیرت ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے لے کر نسیم ہگل تک، فہرست میں شامل ان "مجرموں" میں سے نہ کسی کی بستی اجڑی، نہ کسی کی فصل برباد ہوئی، نہ کسی کے لہلہاتے کھیت ملیامیٹ ہوئے، نہ کسی کی زمین ناقابل

کاشت ہوئی، نہ کسی کی عمر بھر کی پونجی لٹی، نہ کسی کا بچہ یتیم ہوا، نہ کسی کی ماں بیوہ ہوئی لیکن جن کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ان کی اکثریت مذہب پر مرمٹنے والوں کی تھی۔ یہ کیسا تصور ہے۔ مسلکِ اہل حدیث میں اللہ کے انصاف کا کہ کرتا کوئی اور ہے اور بھرتا کوئی اور۔ کاش صفاتِ خداوندی کا تمسخر اڑانے والوں کی گرفت کے لئے بھی کوئی قانون ہوتا۔ طلوعِ اسلام اپنے اکتوبر کے شمارہ میں سیلابِ بلا کے عنوان کے تحت اس موضوع پر تفصیل سے لکھ چکا ہے۔

حُسنِ تحریر

"مسٹر غلام احمد صاحب پرویز کے نظریات کا پرچارک ماہنامہ "طلوعِ اسلام" جس کا مشن ہی اسلامی مسلمات کا انکار اور ان کی دور از کار رکیک تاویلات ہے۔ آئے دن قرآن و حدیث کے خلاف عجیب و غریب شوشے چھوڑتا اور علمائے اسلام کے خلاف جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا ہے۔ علماء اس کو مُنہ اس لئے نہیں لگاتے کہ جہاں تک اس ٹولے کے نظریات کا تعلق ہے اس کی حد تک، وہ مدلل تغلیط و تردید کر کے ان پر اتمامِ حجت کر چکے ہیں، اب وہ کہاں تک اس ٹولے کا تعاقب کریں جب کہ وہ بار بار انہی باتوں کی جگالی کر رہا ہے جس کا وہ پوسٹ مارٹم متعدد مرتبہ کر چکے ہیں۔"

حُسنِ تحریر کا یہ نمونہ جناب صلاح الدین یوسف صاحب کے اس مضمون کا ابتدائیہ ہے جو مئی ۱۹۷۹ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی مخالفت میں ماہنامہ "محدث" نے اپنے اکتوبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔

وہ مومن نہیں
جس کے پڑوسی اُس کی آفتوں سے محفوظ نہ ہوں

حدیثِ نبویؐ

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

خرچ

۳

اسراف و تبذیر

انسان کو محنت کرکے زیادہ سے زیادہ کمانا چاہیئے لیکن اسے اس کمائی میں سے خرچ کرنے میں نہ اسراف کرنا چاہیئے نہ تبذیر۔ اسراف کے معنی ہیں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر کے معنی ہیں بلاضرورت خرچ کرنا۔ ایک مومن کو میانہ روی کی زندگی اختیار کرنی چاہیئے اور اس کے مطابق خرچ کرنا چاہیئے۔

ضرورت سے زیادہ روپیہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کی کمائی اس کی ضرورتوں سے زیادہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں لاکھوں، کروڑوں ایسے آدمی بھی ہیں جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ یا جو کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے کمائی کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی ضروریات کا پورا کرنا اس نظامِ ربوبیت کے ذمے ہے جسے مومنوں کی جماعت قائم کرتی ہے۔ لہٰذا وہ روپیہ جو کسی کی اپنی ضرورت سے بچ جائے اس قسم کے لوگوں کا حق ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۵۱/۱۹)

"ان کی دولت میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہے۔"

دوسروں کا حق

اپنی ضروریات سے جس قدر زیادہ ہو سب کا سب دوسروں کی پرورش کے لئے دے دینا ہوگا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

"تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر مال و دولت اس مقصد کے لئے کھلا رکھنا چاہیئے۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر بھی ضروریات سے زیادہ ہو سب کا سب۔

نظام کے ماتحت

لیکن اس کمائی کو ربوبیت عامہ کے لئے ایک نظام کے ماتحت کھلا رکھنا ہوگا۔ اسی نظام کو 'سبیل اللہ' کہتے ہیں۔ یعنی اللہ کا بتایا ہوا راستہ۔

اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ... ۝ (۲/۱۹۵)

"اپنی کمائی کو خدا کے بتائے ہوئے نظام کی خاطر کھلا رکھو۔"

جب نظام نہ ہو تو...

جب یہ نظام قائم نہ ہو تو اس وقت روپیہ اپنے اپنے طور پر دوسرے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے خرچ کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ صرف مجبوری کی حالت ہے۔ صحیح اسلامی زندگی وہی ہے جس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو۔ اس لئے جب ایسا نظام قائم نہ ہو تو اس قسم کے نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا، مسلمانوں کا اوّلین فریضہ ہونا چاہیئے۔ اسلامی نظام کے بغیر اسلامی زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی۔ اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے۔ اسلامی نظام کو اسلامی حکومت بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جو قرآنی احکام اور قوانین کو نافذ کرے۔

Where such an organization based on Quranic ideals does not exist, you can spend independently on those who need. But the real Islamic way of life is the one where such an organization does exist; but where it does not, you should try to bring it into existence. Such an organization is called an Islamic Government i.e. a government responsible for enforcing the Quranic laws and injunctions. To establish it, is the foremost responsibility of Muslims.

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

HONOURABLE READERS !

PLEASE RENEW YOUR SUBSCRIPTION FOR THE ENSUING YEAR BEFORE DECEMBER 1992.

PLEASE DONATE LIBERALLY FOR THE GIFT SCHEME SO THAT SUPPLY OF MAGAZINE TO LIBRARIES IS NOT AFFECTED.

PLEASE CLEAR ALL OUTSTANDING DUES IN YOUR "PESHGHI KHATAS" BEFORE CLOSURE OF THIS YEAR.

PLEASE REVIEW THE LIST OF SUBSCRIBERS WHOSE SUBSCRIPTION IS CHARGED TO YOUR BAZM/KHATA AND UPDATE THE LIST BEFORE DECEMBER 92.

SPENDING

As stated above, you should put in labour to earn your living. On the other hand you should be moderate in spending from what you have earned. Extravagance is prohibited. The Holy Quran has used the words "Asraf" and "Tabzeer" for this prohibition. " Asraf" means to spend more than what is required to fulfil a certain need; and "Tabzeer" means to spend without any need; as for example extravagant spending on marriages and funerals etc.

The next important question is that if one earns more than what is required for his needs, what should he do with this extra wealth. We all know that there are so many people in this world whose earning is not sufficient to fulfil their basic needs and there are others who are physically unfit to earn on account of disease or accidental injury. To fulfil their needs is the responsibility of the social order established on the basis of Quranic laws. Such needy persons get from the surplus money lying with other persons as a matter of right.

> " And in their wealth and possessions is the right of those who possess less than what they need and those who are unable to earn." (51/19)

How much you should spend on others ?

> " They ask thee how much they are to spend (on others): Say: what is surplus to your needs."

But to keep open for the needy, all that is surplus, should be carried out through a social organization. This is termed by the Quran as:

> "Keep yourearnings open (for the organization) in the way prescribed by Allah."

طلوع اسلام لاہور

طلوع اسلام لاہور

عدنان احمد پرویز

کا درسِ قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵۔ کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ شیخ صلاح الدین	جمعۃ المبارک	۱۰۔ بجے صبح
۲۔ بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر ۵	ہر ماہ پہلا تیسرا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۳۔ پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ / جمعہ	۴۔ بجے شام
۴۔ پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴۔ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۴۰/۱۳۹، مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	۶۔ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰۔ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے بعد نماز جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵۔ ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	//	۸۔ بجے صبح
۱۱۔ حیدرآباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	//	۱۰۔ بجے صبح
۱۲۔ رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰۔ بجے صبح
۱۳۔ سرگودھا	۶۰، اے سول لائنز، ریلوے روڈ	جمعۃ المبارک	۹۔ بجے صبح
		//	
۱۵۔ فیصل آباد	۲۳۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون ۴۲۸۵۵	//	۴:۳۰ بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	ڈاکٹر طارق عزیز فاؤنڈیشن ۵/۸۳۵ سول کوارٹرز غلام محمد آباد رابطہ فون ۳۵۴۸۳۵	//	۵۔ بجے شام

شہر	مقام	دن	وقت
۱۷۔ کوئٹہ	۱۶۶/ڈی۔ جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۵۔ بجے شام
۱۸۔ کراچی	سنووائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہِ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل)۔ فون: ۵۷۲۲۵۱ ــ ۵۴۷۳۲۹	〃	۹:۳۰ بجے صبح
۱۹۔ کراچی	مکان ۱۲۰۶، گلی ۱۰، اے/ بی ۳۶ شریف کالونی لانڈھی	اتوار	۸۔ بجے شب
۲۰۔ کوہاٹ	برمکان شیر محمد، نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	۸۔ بجے صبح
۲۱۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	〃	بعد از نمازِ جمعہ
۲۲۔ گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	۴۔ بجے
۲۳۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹ بجے صبح
۲۴۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	〃	بعد نمازِ مغرب
۲۵۔ ملتان	شاہ سنز، بیرون پاک گیٹ	〃	۱۵۔ بجے صبح
۲۶۔ جوہرآباد	برمکان حکیم فاروق شاہ، قاضی کالونی	〃	بعد نمازِ جمعہ
۲۷۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۹۵ گ ب	〃	بعد نمازِ جمعہ
۲۸۔ ڈی۔جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک ۲، کچہری روڈ	〃	۳۔ بجے سہ پہر
۲۹۔ راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم ۳۰، ملت کالونی کھانگہ سٹیٹ رابطہ: چوہدری نثار احمد، ہائی وے آڈوگوال منڈی ۷۴۷۵۲	〃	۵۔ بجے شام

اوقاتِ درس کے دوران

مجلہ طلوعِ اسلام اور مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز" کی جملہ تصانیف بھی مندرجہ بالا مقامات سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r)

NO RESERVATION REQUIRED

ALL THOSE INTERESTED IN THE TEACHINGS OF QURAN ARE CORDIALLY INVITED.

1. **BIRMINGHAM** 229 Alum Rock Road	Sunday 3 PM
2. **CANADA** 716 The West Mall, Etobicock, ONT Phone (416)245-5322 or(416)620-4471	1st Sunday 11 AM
3. **DENMARK** R.O.Aegte Taepper, Falkoner Aue 79 2000 Fredriksberg C.	Last Sat **2 PM**
4. **KUWAIT** Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain Phone 5316273	Friday 5PM
5. **LONDON** 76 Park Road Ilford Essex Phone 0 1-553-1896	1st Sunday 2.30 PM
6. NORWAY Akeberg Veien-56 -Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sunday 4PM
7. **YARDLEY** 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM.

TOLU-E-ISLAM MAGAZINE AND PUBLICATIONS OF ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ(r) ARE ALSO AVAILABLE AT THE ABOVE PLACES